تعمیرِ حیات لکھنؤ

پندرہ روزہ

مجلس صحافت و نشریات دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۲۳ — ۲۵ مارچ ۱۹۸۶ء مطابق ۱۳ رجب المرجب ۱۴۰۶ھ — شمارہ نمبر ۱۰

اداریہ

شمس الحق ندوی

ایک خوش آئند اقدام لیکن ...

پارلیمنٹ میں مسلم پرسنل لا سے متعلق نفقۂ مطلقہ کے بارے میں بل پیش ہے اور یہ بل بقول وزیر اعظم مسلم پرسنل لا کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلام دنیا کا وہ پہلا مذہب ہے جس نے عورتوں کو برابری کے حقوق دیئے ہیں انہیں جائیداد میں حصہ دار بنایا ہے، یہاں تک کہ ایک عورت مختلف روپ میں اپنے رشتہ داروں سے حصہ پاتی ہے یہ صرف اسلام کی دین ہے ہم نے ہندو کوڈ بل مسلم پرسنل لا ہی سے اخذ کیا ہے۔ وزیر اعظم نے بل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا "لوک سبھا میں جو بل لایا گیا ہے اس کا دائرہ زیادہ وسیع ہے، وہ مسلم خواتین کو زیادہ تحفظ مہیا کرتا ہے اور خاصے فائدے پہنچاتا ہے، ضابطہ فوجداری کی دفعات ۱۲۵ اور ۱۲۷ کے برخلاف نئے بل کی روشنی میں مسلم خواتین سے متعلق طلاق کے مقدمات کے فیصلے صرف تیس دنوں کے اندر ہو جایا کریں گے اور اب ایک مسلم مطلقہ کو پوری امداد ملے گی، جب کہ اس سے قبل ان دونوں دفعات سے جو امداد دی جاتی ہے وہ عارضی نوعیت کی تھی، جب تک مسلم پرسنل لا سے متعلق مختلف ادارے فیصلہ نہ کریں اس مرحلہ میں کافی تاخیر ہوتی تھی"۔

کافی تاخیر ہوتی تھی وزیر اعظم کے ان الفاظ کا کھلا ہوا ثبوت خود شاہ بانو کیس ہے، جس کا فیصلہ چھ سال سے زائد مدت میں ہوا اور دس ہزار سے زائد اخراجات مقدمہ کی پیروی میں ہوئے، شاہ بانو کے لڑکے وکیل ہیں صاحب حیثیت ہیں آن اور اکڑ میں یہ مقدمہ لڑتے رہے، کیا ہر مطلقہ ایسا کر سکتی ہے؟ ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے جب عزیزہ نامی ایک مطلقہ کو خودکشی کے اقدام سے بچاتے ہوئے لکھنؤ لیڈیز پولیس نے حاضر عدالت کیا تھا تو پولیس کے اس سوال پر کہ تم نے اپنا کیس عدالت میں کیوں نہیں پہنچایا، عزیزہ نے سسکیوں کے درمیان کہا کہ "پیش کار، منشی، وکیل سب کا خرچہ دینا ہوتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے اسی لئے گذارے کے معاملہ کو دوبارہ عدالت میں نہیں لے جا سکی"[1]

بل میں ایسی کوئی قانونی کمزوری یا نقص نہیں ہے جس سے دوسرے مذاہب کے پرسنل لا پر کوئی اثر پڑے نہ ہی اس سے کسی طبقہ یا مذہب کے ماننے والوں کو کوئی نقصان پہنچتا ہے، مگر بل کے خلاف ہمارا قومی پریس اور کچھ نام نہاد روشن خیال لوگ محض تعصب اور ضد میں اس طرح میدان میں اتر آئے اور اس کی مخالفت پر ایسا واویلا شروع کر دیا ہے جیسے گویا ہمارا ملک اس وقت جنگی حالات سے دوچار ہے، ان کے نزدیک اس وقت ملک کے لئے گویا ایک عظیم خطرہ درپیش ہے، سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں جو عورتیں ہمارے ملک میں جلائی جا رہی ہیں وہ کون ہیں ہندو یا مسلمان؟ ہمارے پریس اور مسلم مطلقہ سے ہمدردی رکھنے والے رحم دل بھائیوں کو ان جلائی جانے والی عورتوں کی کوئی فکر نہیں اس پر کوئی ہنگامہ نہیں، اسی طرح مطلقہ عورتوں پر مگرمچھ کے آنسو رونے والے ان لوگوں کو ان بیواؤں کی کوئی فکر نہیں جو ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں، اور جن کے شوہروں کو فسادات میں جلا اور مار ڈالا جاتا ہے اور کتنی وہ عورتیں ہیں جن کو طلاق تو نہیں دی جاتی، مگر اخلاقی قدروں کے پامال ہونے کے سبب عمر بھر انہیں عذاب میں رکھا جاتا ہے اور ان کے شوہر اپنی آمدنی کا بڑا حصہ غیر عورتوں پر یا فحاشی کے اڈوں پر خرچ کرتے ہیں گھٹ گھٹ کر زندگی کے دن کاٹنے والی ان عورتوں پر کسی کو ترس نہیں آتا، اور اس عورت کے لئے جس کو اسلام نے ہر حال میں خواہ وہ بیوہ ہو کہ مطلقہ یا غیر شادی شدہ، اتنے حقوق دیئے ہیں اتنی رعایتیں رکھی ہیں کہ طلاق پا جانے یا بیوہ اور غیر شادی شدہ ہونے کی وجہ سے شاید ہی کوئی مسلمان عورت آپ کو بھیک مانگتی نظر آئے (جہاں تک ملک کی عام غربت کا معاملہ ہے وہ الگ چیز ہے) مگر اس کے لئے اس وقت ہمارا پریس اور متعصب پڑھے لکھے لوگ اس قدر بے چین نظر آ رہے ہیں جیسے اسی بل پر ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

ذرا دیر کے لئے وہ تعصب کی عینک اتار کر اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو ان کو ہزاروں عورتوں کے جسم سے اٹھتا ہوا دھواں دکھائی دے گا اور ان کی آہ و بکا مظلومیت و بے چارگی کی تصویریں دل کو ہلا کر رکھ دیں گی، مگر انہیں

[1] قومی آواز: ۲ ستمبر ۱۹۸۵ء

نگرانِ اعلیٰ

مولانا ابو العرفان ندوی

مجلس ادارت

شمس الحق ندوی

محمود الأزہار ندوی

خط و کتابت کا پتہ:

نیجر "تعمیرِ حیات"

پوسٹ بکس نمبر ۹۳

ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ۔ انڈیا۔

زرِ تعاون

سالانہ : تیس روپے
ششماہی : بیس روپے
فی پرچہ : ایک روپیہ پچاس پیسے

بیرونِ ملک

بحری ڈاک / رجسٹرڈ ڈاک : ۱۰ ڈالر

فضائی ڈاک

ایشیائی ممالک : ۱۵ ڈالر
افریقی ممالک : ۱۸ ڈالر
یورپ و امریکہ : ۲۰ ڈالر

نوٹ

چیک، ڈرافٹ سکریٹری مجلس صحافت و نشریات لکھنؤ کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیرِ حیات کے پتہ پر روانہ فرمائیں۔

اس دائرہ میں اگر سرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ دین و ادب کا یہ خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان، آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے تو سالانہ چندہ مبلغ پچیس روپے ارسال فرمایئے یہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

کامیابی کی ضمانت خواہشات نہیں حقائق ہیں

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صدر مسلم پرسنل لا بورڈ کی حیدرآباد تشریف آوری کے موقع پر مجلس اشاعت اسلام اور اسلامک لا اکیڈمی کی ایک مشترکہ نشست منعقد ہوئی جس میں شہر کے معزز علماء وکلاء اور دانشور شریک تھے۔ اس مجلس میں مولانا محمد تقی الدین صاحب نے مجلس اشاعت اسلام کی سرگرمیوں پر اور جناب محمد یوسف الدین قیصر ایڈووکیٹ سکریٹری اسلامک لا اکیڈمی کے مقاصد اور اس کی تشکیل کے محرکات پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے جو بصیرت افروز خطاب فرمایا وہ ہم جناب محمد عبد الرافع لطیفی مدیر رہگذر حیدرآباد کے شکریہ کے ساتھ قارئین تعمیر حیات کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

خواہشات اور حقائق میں فرق

الحمد للہ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ۔

اما بعد! ــــــ حضرات میں بہت شکر گذار ہوں ان تمام احباب و معززین کا جنہوں نے اس مجلس کا انتظام کیا اور موضوع و مقصد سے تعلق و دلچسپی رکھنے والے حضرات کو جمع کیا، ان میں سے اکثر کے پاس میں خود براہ راست نہیں جا سکتا تھا۔ اور نہ میرے پاس اتنا وقت تھا۔ اور پھر انھوں نے اتنے اہم موضوع پر ہمیں معلومات فراہم کیں۔ اور اس کو ہمارے سامنے لائے۔ دنیا میں دو چیزیں ہمیشہ سے رہی ہیں۔ اور وہ ہیں انسانی نفسیات اور فطرت انسانی کا خاصہ ہیں ایک تو ہیں خواہشات اور ایک ہیں حقائق۔ سنت اللہ بھی یہی ہے۔ اور عقل کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ اس دنیا میں اقوام و ملل کی قسمتوں، ان کی تقدیر اور جرأت کے آگے یہ بھی کہتا ہوں کہ مذاہب اور ان کی صورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ واقعات و حقائق کے ساتھ ہے۔ خواہشات کے ساتھ نہیں ہے۔ قرآن مجید میں آپ کو یہ دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ملیں گی۔

لیس بامانیکم ولا امانی اھل الکتاب من یعمل سوءً یجز بہ۔

اس آیت میں دونوں چیزوں کی پوری نمائندگی ہے۔ جہاں تک خواہشات کا تعلق ہے اخلاقی و عقلی حیثیت سے یہاں تک کہ دینی و روحانی حیثیت سے کیسی ہی عزیز اور قابل احترام ہوں۔ لیکن فیصلہ خواہشات پر نہیں ہے۔ لیس بامانیکم اور یہ بھی قرآن کی حکمت ہے کہ ولا امانی اہل الکتاب سے پہلے لیس بامانیکم فرمایا۔ تاکہ یہ خیال نہ ہو جہاں تک مذاہب باطلہ کا تعلق ہے ان کی خواہشات پر کیا فیصلہ ہوگا۔ ان کی کیا قیمت ہے۔ تو پہلے کہا۔ اور یہ قرآن مجید کا امتیاز ہے کہ تمہاری۔ اور آپ یہ بھی دیکھ لیجئے کہ مخاطب کون ہے؟ مخاطب بعد کی آنے والی نسلیں تو بعد میں ہیں۔ ثانوی درجہ میں ہیں مخاطب صحابہ کرامؓ ہیں۔ اصحاب بیعت رضوانؓ اصحاب بدر ہیں۔ اور عشرۂ مبشرہؓ ہیں۔ ان سب کو مخاطب کر کے فرمایا گیا۔ "لیس بامانیکم" تمہاری خواہشات پر بھی فیصلہ نہیں ہے۔ ولا امانی اھل الکتاب "ہمارے یہاں کا اٹل قانون ہے کہ "من یعمل سوءً یجز بہ" یعنی عمل کا نتیجہ ظاہر ہوگا۔ اس کو عمومی دائرے میں لیں۔ تو "من یعمل سوءً یجز بہ" کا تعلق صرف عالم آخرت ہی سے نہیں ہے بلکہ اس تکوینی دنیا اور عالم آخرت دونوں سے ہے۔ ہمارے یہاں قانون یہ ہے کہ جو عمل کرے گا اس کی جزا ظاہر ہوگی۔

بقائے انفع

دنیا میں ہمیشہ سے، بلکہ آخری دور میں خاص کر یورپ میں ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر یہ اصول تسلیم کیا گیا ہے اور جس کو Survival of the fittest. کے عنوان یاد کیا جاتا ہے۔

"بقاء اصلح" جو زیادہ صالح ہوگا وہ باقی رہے گا۔ اس کی بنیادیں مذہبی کتابوں اور مذہبی انسانوں کے بیانات میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ قرآن مجید میں اس سے بھی آگے کا اصول بیان کیا گیا ہے۔ جو نفسیات قرآنی اور نفسیات دینی سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ جو دوسرا قانون ہے وہ ہے بقائے انفع کا۔ "فاما الزبد فیذھب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض" (الرعد-۱) اس میں ایک حکمت ہے جو قابل غور ہے۔ "بقائے اصلح" کا فیصلہ بڑا مشکل ہے۔ "اصلح" اصل میں اسم تفضیل کا صیغہ ہے، اشیائے صالحہ میں اصلح کا فیصلہ اشیائے فاسدہ میں صالح کا فیصلہ نہیں ہے۔ بقائے اصلح کے معنی یہ ہیں کہ جو صالح چیزیں ہیں ان میں اصلح کونسا ہے۔ اشیائے صالحہ جن کو زندگی کا حق ہے۔ جو کشمکش حیات میں پوری اتر سکتی ہیں وہ چیزیں وہ نہیں ہیں۔ بلکہ ان اشیائے صالحہ میں اصلح کونسا ہے اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ کون سی عدالت کرے گی۔ لیکن فطرت انسانی ترتیب سے ایسی ہے کہ نافع کا فیصلہ تو جلد کر لیتی ہے۔

نافع کا فیصلہ

نافع کا فیصلہ ہر دور میں یعنی علم و ترقی کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی اور علم و ترقی کی پستی اور ابتدائی حالت میں بھی۔ نافع کا فیصلہ فطرت انسانی کی وہ صلاحیت ہے وہ ملکہ ہے جو ہمیشہ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں (چونکہ یہ کتاب کتاب انسانیت ہے، پوری نوع انسانی کو یہ صحیفہ دیا گیا ہے۔ یہ ہر دور کا ہے اور عقلی و علمی، روحانی و عملی جتنی سطحیں ہو سکتی ہیں ان سب پر حاوی ہیں) اس لئے قرآن مجید نے اس کو بقائے اصلح پر نہیں چھوڑا، بلکہ بقائے انفع کا اصول بتایا ہے۔

ہم میں کا ایک بچہ بھی یہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ اس کے لئے زیادہ مفید ہے، اس سے اس کو زیادہ آرام ملے گا۔ والدین کے حق میں اس کا یہی تجربہ ہوتا ہے کہ وہ ان کو انفع سمجھتا ہے۔ اپنے عزیز و اقارب کو وہ انفع سمجھتا ہے۔ جو زیادہ پڑھے لکھے تجربہ کار اور عقلمند ہوتے ہیں ان کے متعلق بھی بچہ اگر وہ فاتر الاستعداد نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اصطلاح میں زیادہ بھی یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ یہ میرے لئے زیادہ مفید ہے۔ تو بقائے انفع ایک ایسا اصول ہے جو نوع انسانی اور تاریخ

انسانی کے ہر دور اور نوع انسانی کی ہر نسل میں وہ کام دیتا ہے۔ تو قرآن مجید نے یہ کہہ دیا: "فاما الزبد فیذھب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض" میں نے یہ تمہید اس لئے بیان کی کہ خواہشات اور حقائق یہ دو چیزیں ہیں۔ اور اس میں قومی، ملی، حکومتی، انفرادی اور عوام کی جمہوری سطح پر بڑی غلطی ہے کہ خواہشات کو خواہشات سے بہ نسبت حقائق کے زیادہ وابستگی رہی ہے۔

حقائق کو صحیح طور پر محسوس نہ کرنا اور ان حقائق کا تقاضہ پورا نہ کرنا ایسی غلطی ہے کہ اس میں بڑی بڑی طاقتور حکومتیں رومن ایمپائر اور پرشین ایمپائر اور پھر اخیر میں خلافت اندلس کی مستحکم وسیع اور طویل المیعاد سلطنت اور اسی طریقے سے خلافت عباسیہ اور پھر خوارزم شاہ کی وہ شہنشاہی کہ جو ساری اسلامی سلطنتوں کو اس نے اپنے اندر ضم کر لیا تھا۔ اگر ہم ان کی تاریخ پڑھیں گے اور ان کے زوال کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو حقائق سے نظر لونگی نظر آئے گا۔

عملی بات

ہندوستان میں ہماری خواہش ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ عربی زبان یہاں رائج ہو مجھے یاد ہے وہ زمانہ جب پاکستان میں کچھ عرب زعماء کے اثر سے یہ چرچا تھا کہ پاکستان کی زبان عربی بنا دی جائے تو اس وقت باوجود اس کے کہ میں عربی زبان کا خادم ہوں وہ میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کے بعد عربی یا عربی کے بعد اردو دونوں میں برابر ہوں تو اس وقت میں نے کہا تھا کہ یہ ہونے والی بات نہیں ہے۔ جو بات ہو سکتی ہے اس پر طاقت صرف کرنی چاہیئے۔ پاکستان کی زبان بدل جائے۔ یہ تو عربوں کے ابتدائی دور میں ہوا تھا مصر کی زبان بدل گئی، شام کی زبان بدل گئی۔ یہ بات عملی نہیں ہے، عملی یہ ہے کہ وہاں اردو قائم رکھی جائے اور اس کو زیادہ سے زیادہ اسلامی مواد سے مالا مال کیا جائے، اس کی روح بدل جائے۔ اس کا مزاج اسلامی کیا جائے تو اسی طریقہ سے ہندوستان میں ہماری خواہش ہے اس وقت میں حیدرآباد میں بات کر رہا ہوں جس نے اردو کی ایسے وقت میں سرپرستی کی جب کہ ہندوستان کی کسی ریاست میں سرپرستی نہیں کی جا رہی تھی۔ سیدھی بات تو یہ ہے کہ اردو کی بقاء

میر باقی کی بنوائی ہوئی بابری مسجد کا تصفیہ فوراً کیا جائے

ڈاکٹر رمیش پرشاد گرگ

سابق کانگریسی وزیر داؤ دیال کھنہ کا یہ مطالبہ کہ رام جنم بھومی اجودھیا، کرشن جنم بھومی متھرا اور وشوناتھ مندر وارانسی ہندوؤں کو واپس لوٹائی جائے، محض فرقہ واریت کو ہوا دینا اور مذہبی منافرت پیدا کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور اسی طرح کی دیگر فرقہ پرست جماعتوں کے افراد اور لیڈر بھی ان کے اس گندے منصوبہ میں ان کا ساتھ دے رہے ہیں جو کسی حالت میں اس جمہوری اور سیکولر ملک کے مفاد میں نہیں ہے، ہندوستان سیکڑوں برسوں سے مختلف مذاہب کے لوگوں کا گہوارہ چلا آرہا ہے اور مختلف تہذیبیں اس ملک میں پلتی رہی ہیں (انگریزوں کی آمد سے قبل اس ملک

> اس طرح کا الزام لگانے والے ہندوستان کو مذہبی جنگ کی آگ میں جھونکنا اور مسلم ملکوں کے ساتھ تعلقات خراب کرنا چاہتے ہیں

کی سرزمین پر ہندو مسلم فساد ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے) اس سے قبل ایک ریاست کی دوسری ریاست سے اقتدار کے لئے جنگ کثرت سے ہوئی ہے، ہندو راجاؤں کی فوجوں میں مسلمان کثرت سے سپہ سالار اور سپاہی کی حیثیت سے شامل تھے، اور مسلمان بادشاہوں کی فوجوں میں ہندو سپہ سالار اور سپاہی رہتے تھے، اور یہ لوگ اپنے حکمرانوں کا پوری دیانت داری اور وفاداری کے ساتھ ساتھ دیتے تھے۔ اکبر اعظم کی حکومت کو مستحکم بنانے میں راجہ مان سنگھ، ٹوڈر مل اور بیربل و دیگر راجپوتوں نے نمایاں رول انجام دیا اسی طرح شیواجی اور پیشوا باجی راؤ کی فوج میں مسلمان سپاہی پیش پیش رہے ہیں، انگریزوں نے اس ملک میں اپنی حکومت کو مضبوط بنانے اور ہندو مسلم طبقہ میں نفرت پیدا کرنے کی غرض سے کچھ تعصب میں ڈوبی ہوئی تاریخی کتابیں لکھوا کر نصاب تعلیم میں شامل کیں جن سے یہ

معلوم ہوسکے کہ اس ملک پر حکومت کرنے والے مسلمان بادشاہ ظالم و جابر اور ہندو مندر توڑنے والے ہندوؤں کے قاتل تھے جب کہ مسلم حکمرانوں کی انصاف پروری، ہندو دوستی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے اور اس حقیقت کا اعتراف سبھی انصاف پسند مورخوں نے کیا ہے سرجدو ناتھ سرکار، ایشوری پرشاد، ڈاکٹر تاراچند جیسے مورخوں نے بابر، ہمایوں اور اکبر کی مذہبی رواداری کی تعریف کی ہے، ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے لکھا ہے کہ بابر نے اپنے بیٹے نصیر الدین محمد ہمایوں کو مذہبی تعصب سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی، اس نے ہندو رعایا کی دلجوئی کے لئے گئو کشی پر پابندی لگانے کا مشورہ بھی دیا تھا پھر یہ مان لینا کہ بابر نے رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر اس پر مسجد تعمیر کرا دی، بہت بڑی حماقت ہے، رام چندر جی ہندوؤں کے مقدس رہنما ہیں بابر مذہب اسلام کا کٹر پابند تھا، بانی اسلام حضرت محمد صاحب کی تعلیم کے مطابق کسی بھی فرقے کے معزز افراد کی تعظیم کرنا واجب ہے۔ ایسی صورت میں بابر اپنے مذہبی رہنما کی تعلیم سے انحراف

> مسلمانوں نے اس ملک پر سیکڑوں سال تک حکومت کی ہے اگر یہ لوگ واقعی مندر شکن اور ہندو مذہب کے دشمن ہوتے تو ایک بھی قدیم مندر آج ہمیں دیکھنے کو نہ ملتا، مندر توڑے جانے کا الزام ان بادشاہوں پر بہتان تراشی ہے

کر کے مندر کیسے توڑ سکتا تھا، اگر وہ ایسا کرتا بھی تو اس پر اپنا محل، قلعہ وغیرہ تو بنوا سکتا تھا، مسجد ہرگز نہ تعمیر کرواتا، کیونکہ مسجد کے بارے میں اسلام مذہب کا یہ بہت ہی واضح اصول ہے کہ وہ پاک و صاف زمین پر تعمیر ہونی چاہئے کسی کی زمین غصب کر کے اس پر مسجد تعمیر کروانا ناجائز ہے اور ایسی مسجد میں نماز پڑھنے پر نمازی ثواب سے محروم ہو جاتا ہے شریعت کی اس واضح ہدایت کو جانتے ہوئے بابر ایسا غلط کام ہرگز نہیں کر سکتا تھا، رام مندر توڑ کر مسجد بنانے کا الزام لگانا تاریخی حقیقت کو جھٹلانا ہے اس طرح کا الزام لگانے والے ہندوستانی

کو مذہبی جنگ کی آگ میں جھونکنا اور مسلم ملکوں کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات کو خراب کرنا چاہتے ہیں۔

> انگریزوں نے اس ملک میں اپنی حکومت کو مضبوط بنانے اور ہندو مسلم طبقہ میں نفرت پیدا کرنے کی غرض سے کچھ تعصب میں ڈوبی ہوئی تاریخی کتابیں لکھوا کر نصاب تعلیم میں شامل کیں،

جہاں تک تاریخی اور دستاویزی ثبوت کا سوال ہے بھگوان شری رام، بھگوان شری کرشن اور بھگوان شیو کسی کا بھی جنم استھان تاریخی کتابوں سے ثابت نہیں ہے یہ سبھی رہنما پورانک مہاپرش ہیں، بکرمی سمبت سے ہزارہا سال قبل یہاں اس ملک کی سرزمین پر ہوئے ہیں، بالمیکی رامائن، مہابھارت، وشنو پران، بھگوت گیتا، ہنومان چالیسا، تلسی رامائن جیسی مقدس کتابیں بھی ان مہاپرشوں کے جنم کے بارے میں خاموش ہیں، گوسوامی تلسی داس جی تو اکبر اعظم کے دور حکومت میں ہوئے تھے اگر بابر بادشاہ نے رام جنم بھومی کو توڑ کر بابری مسجد تعمیر کروائی تھی تو کم سے کم گوسوامی جی کو اپنی رامائن یا دیگر کتابوں میں اس کا ذکر کرنا چاہئے تھا، انگریزی دور حکومت میں بھی ہندو قوم میں متعدد دانشور، مفکر، مورخ، مذہبی اور سیاسی رہنما ہوئے کم از کم ان رہنماؤں کو ہی اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہئے تھا لیکن سوامی دیانند سرسوتی، سوامی وویکانند، رام کرشن پرم ہنس، راجہ رام موہن رائے، لوک مانیہ تلک، لالہ لاجپت رائے، بپن چندر پال، دیش بندھو چترنجن داس، پنڈت موتی

لال نہرو، مہاتما گاندھی، بابو شیو پرشاد گپتا، چکرورتی راج گوپال آچاریہ، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن، منشی پریم چند، ڈاکٹر سمپورنانند، ڈاکٹر رام منوہر لوہیا، مرارجی ڈیسائی، چودھری چرن سنگھ، سردار پٹیل جیسے منصف مزاجوں میں سے کسی نے بھی اپنی تحریر سے بابری مسجد کے رام جنم بھومی مندر ہونے کی کوئی شہادت نہیں دی، جب کہ بابری مسجد کا وجود ۹۳۵ھ سے اب تک ثابت ہے، مسجد کی تعمیر کی بابت جو کتبہ لگا ہوا ہے اس سے اس کا سن تعمیر ۹۳۵ھ ثابت ہے، کتبہ کے مطابق بابر کے جرنیل میر باقی نے اس کو تعمیر کرایا تھا "بود خیر باقی" سے اس کا سن تعمیر نکلتا ہے، یہ مسجد وقف بورڈ میں ۱۹۳۶ء سے درج ہے اور مسلمان اس مسجد میں ۱۹۴۹ء تک برابر نماز ادا کرتے رہے ہیں، جج، این اگروال ڈپٹی کمشنر فیض آباد نے اپنے حلف نامہ میں کہا ہے کہ یہ جائیداد بابری مسجد کہی جاتی ہے اور ایک زمانے سے مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے اس سے شری رام چندر جی کے مندر سے کوئی تعلق نہیں ہے، ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں رام چندر جی کی مورتی دھوکہ دھڑی سے

> جو مسئلہ پوری دنیا کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الجھا سکتا ہو اسے صوبائی حکومت نے معمولی سمجھ کر کیسے نظر انداز کر دیا۔

اس مسجد میں رکھ دی گئی، اس وجہ سے امن و امان کو خطرہ پیدا ہوا، اس لئے حکام کو مداخلت کرنی پڑی،

جے این اگروال کا یہ حلف نامہ مسجد اور مندر کے مقدمہ کے سلسلہ میں فیض آباد کی عدالت میں داخل ہے جسے دیکھا جا سکتا

ان کی فکر نہیں، ان کو فکر ہے تو مسلمان مطلقہ کی، انہیں اس مسلمان عورت کی بڑی فکر ہے جس کو اس کے مذہب نے دنیا کے تمام مذاہب سے کہیں بڑھ چڑھ کر حق دیا ہے، عزت دار اونچا مقام عطا کیا ہے، ماں کی حیثیت سے بھی بہن اور بیٹی ہونے کی حیثیت سے بھی بیوی اور شریک حیات کی حیثیت سے بھی جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مگر بدھ مت میں اس بے چاری عورت کو جس طرح مجرم بنایا گیا ہے اس کی انہیں کوئی فکر نہیں،

عورتیں اتنی ہی بری ہیں جتنا کہ جھوٹ، ایک مسلم حقیقت تھی، عورت کی فطرت میں یہ داخل ہے کہ وہ مردوں کو اس دنیا میں غلط راستہ پر ڈالے، اسی لئے عقلمند بے فکر ہو کر عورتوں کی صحبت میں نہیں بیٹھتے،

بچپن کی شادی کی رسم و رواج بیواؤں سے نفرت، ستی اور پردہ ایک ایسے سماج کے حسب حال ہیں، جس میں عورتوں کی حیثیت بچے جننے والی مخلوق سے زائد نہیں، شاید نوزائیدہ لڑکیوں کی موت

> تعصب کی عینک اتار کر اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو ان کو ہزاروں عورتوں کے جسم سے اٹھتا ہوا دھواں دکھائی دے گا اور ان کی آہ و بکا مظلومیت و بے چارگی کی تصویریں دل کو ہلا کر رکھ دیں گی۔

انسائیکلوپیڈیا "کے مقالہ نگار نے ایک بدھ مفکر کی کتاب "BUDDHA" مطبوعہ ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۶۹ پر جو کچھ لکھا ہے آپ بھی اسے پڑھ لیجئے۔

"پانی کے اندر مچھلی کی ناقابل فہم عادتوں کی طرح عورت کی فطرت بھی ہے اس کے پاس چوروں کی طرح متعدد حربے ہیں اور سچ کا اس کے پاس گذر نہیں"[1]

ہندوستان میں عورتوں کو جو پست اور حقیر مقام دیا گیا ہے اس پر انہیں کوئی غصہ نہیں آتا۔ یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ میں (RAY STRACHEY) لکھتا ہے۔

"رگ وید میں (جس میں انسان کے جد امجد کی حکایات بھی ہیں) عورتوں کو پست اور حقیر مقام دیا گیا ہے بعد میں یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ روحانی طور پر ناقابل اعتبار بلکہ تقریباً بے روح ہے، اور موت کے بعد مردوں کی نیکیوں کے بغیر اس کو بقا نہیں حاصل ہو سکتی اس کی ساری امیدوں کو ختم کرنے والے مذہب کے ساتھ رسم و رواج کی بیڑیوں نے (جو رفتہ رفتہ پیدا ہوتی گئیں) یہ ناممکن کر دیا کہ عورت کسی نمایاں شخصیت کو جنم دے سکے عورتوں کو جنم دینے والے منو نے انہیں اپنے گھر، بستر، زیور کی محبت، بری خواہشیں، غصہ، بے ایمانی اور برے اطوار عطا کئے

ایک ایسی دنیا میں ان کے لئے رحمت ہے جس میں اسے مشکوک، برائی کا سرچشمہ، دھوکہ باز، سورگ کے راستہ کا روڑا، اور نرک کا دروازہ سمجھا جاتا ہے[2]

ان کو اپنی کٹی ہوئی دم کے شرم کو چھپانے کے لئے یہ فکر ہے کہ مسلمانوں کے طلاق کے مسئلہ کو ایسا مشکل بنا دیا جائے کہ وہ بھی ان کی طرح عورتوں کو جلانا شروع کر دیں، مزید تفصیل میں قارئین کا وقت ضائع نہ کر کے یہاں دہلی کے مشہور ہندی روزنامہ "جن ستا" میں ۵ اگست ۱۹۸۵ء کے شمارے میں نیوز ایجنسی "وارتا" کے نمائندہ کی رپورٹ کا ایک جز ملاحظہ فرمالیں جس

> سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں جو عورتیں ہمارے ملک میں جلائی جا رہی ہیں وہ کون ہیں ہندو یا مسلمان؟

میں بنارس کا کچھ حال یوں بیان ہوا ہے،

[1] تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، صفحہ ۶۵

[2] تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات واحسانات، صفحہ ۶۷ مؤلفہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی۔

"یہ قدیم شہر یعنی وارانسی جب نیند کے میٹھے خمار میں کروٹ بدل رہا ہے اپنے سماج اور کنبہ کی دھتکاری ہوئی ہندو بیوائیں، میلی کچیلی سفید پھٹی ساڑیوں میں ملبوس وہ منہ اندھیرے گھاٹ کی طرف بھاگنے لگتی ہیں، آئینہ دیوی بھی جو اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں من کنیکا گھاٹ کی سیڑھیوں پر گن رہی ہے وہ کہتی ہے۔

"ایک وقت تھا کہ میرے دروازے پر صدا لگائے کوئی دکھیارا خالی ہاتھ نہ لوٹتا تھا، میرا رحم و کرم اور شفقت و محبت کا آنچل اسے ڈھانپ لیتا تھا لیکن آج اس گھاٹ کی سیڑھیاں چڑھنے والے ہر شخص کے پاؤں چھوتی ہوں، کہ ان داتا صرف ایک روٹی کا سوال ہے"

اس مذہبی شہر کی بھول بھلیوں والی تنگ گلیوں سے دوڑتی ہوئی ان عورتوں میں سے کچھ تو دلشاد سمیدھ گھاٹ کی سیڑھیوں

> عزیزہ نے سسکیوں کے درمیان کہا کہ پیشکار، منشی، وکیل، سب کا خرچہ دینا ہوتا ہے جو میرے پاس نہیں ہے اسی لئے گذارے کے معاملہ کو دوبارہ عدالت میں نہیں لے جا سکی،

پر کٹورا لے کر بیٹھ جاتی ہیں اور اوپر والے کی دہائی دے کر ایک پیسے کا سوال کرتی ہیں جب کہ دیگر اپنے ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگا کر مندروں کے سامنے آگے پیچھے بیٹھ جاتی ہیں، گنگا میں ہر روز ڈبکی لگانے والوں کے لئے گھاٹ کی سیڑھیوں پر جمگھٹ لگانے والی بیواؤں کی کوئی وقعت نہیں، کسی تیرتھ یاتری یا سیاح کا مقدس گنگا جل کو چھوئے بغیر ان کو بھیک دینا ممکن نہیں،

"وارتا" کے نمائندے کو ایک مقامی پنڈا ابناری جھا نے بتایا کہ یہ بیوائیں سوال نہیں کرتیں کچھ بھیک چاہتی ہیں اور ان کے برتن میں شاید ہی اتنے پیسے پڑتے ہوں گے کہ یہ ایک وقت کی روٹی بھر پیٹ کھا سکیں، پنڈت کی بات جاری ہی تھی کہ چند گز کے فاصلہ پر تین بیوائیں آپس میں جھگڑ رہی ہیں، بات یہ تھی کہ ایک گجراتی تیرتھ یاتری ان کو بھیک میں چند آم دے کر چلا گیا جس میں وہ اپنا اپنا حصہ

مانگ رہی تھیں، ایک کہہ رہی تھی کہ بھگوان کے لئے یہ مجھے دے دو، اس پیٹ میں ایک دانہ نہیں گیا ہے، جھری بھرے چہرے والی اس بڑھیا کے حلق سے آواز بھی نہیں

> آج میری کوئی خبر گیری کرنے والا نہیں، اب تو کبھی کے در پر بیٹھ کر کھا لیتی ہوں کبھی بار تو جانوروں کے ساتھ بھی۔

نکل پا رہی تھی، قریب جا کر دیکھا تو وہ آنکھوں سے معذور تھی، سب انسپکٹر رتن لال نے بتایا کہ کچھ بیوائیں شہر کے باہر حصہ شیو داس پور اور دال منڈی میں رنڈیوں کے کوٹھوں پر پہنچ گئی ہیں کیونکہ وہ کم عمری ہی میں بیوہ ہو گئی ہیں (کہ ہندو سماج میں بیوہ کی شادی نہیں) ان سے کوئی ہمدردی کے دو بول کہے تو ان کا مہر سکوت ٹوٹ جاتا ہے، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جاتی ہے اور وہ اپنی داستان غم سنانے لگتی ہیں ان میں سے ایک واسنا وتی دیوی بتاتی ہے کہ کلکتہ میں ہمارا چھوٹا سا کنبہ تھا، شوہر کو شراب کی لت لگ گئی تھی اس نے کہا آج سے ۲۰ سال پہلے میرے شوہر ایک رنڈی کو لے آئے اور مجھے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا، میں اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اور ہوش آیا تو پتہ چلا کہ میرے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لئے مجھ پر بند ہو چکے ہیں، تین ہی ماہ بعد میرے شوہر کا انتقال ہو گیا میں نے نئی زندگی کی

> اس وقت ہمارا پریس اور متعصب پڑھے لکھے لوگ اس قدر بے چین نظر آرہے ہیں جیسے اس پر ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے

شروعات کے لئے بنارس کی ٹرین پکڑی۔

۵۵ سالہ آئینہ دیوی بڑے خوشحال گھرانے کی تھی اس نے کہا کہ میرے شوہر کی موت کے بعد ساری جائیداد مجھے ملی میں نے بعد میں سب کو اپنے بیٹے کے نام کر دیا بس اسی دن بہو اور بیٹے نے مجھے لات مار دی، تو اس نے کنیکا گھاٹ کی سیڑھیوں پر آ گری، ایک وقت تھا کہ میں دوسروں

(بقیہ ص پر)

کیا یہ حقیقت ہے؟

رامچندر جی اجودھیا میں پیدا ہی نہیں ہوئے — پنڈت واجپئی

اجودھیا کو رامچندر جی کی جنم بھومی کہنا ہندو مذہب کے بنیادی معتقدات کے منافی

علم نجوم و ہیئت کے ماہرین، ہندو مذہب کی بنیادوں پر نگاہ رکھنے والوں اور رفتار زمانہ کا تعین کر کے اس کرہ ارض کی عمر ناپنے والوں کے مرتب کردہ اصول و ضوابط پر نگاہ ہو تو پھر یہ کہنا بڑا مضحکہ خیز ہے کہ شری رامچندر جی اجودھیا میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی پرستش اس مندر میں ہو سکتی ہے جس کو دو ہزار سال قبل راجہ وکرما دتیہ نے بنوایا تھا۔ اور بعد میں جس کو شہنشاہ بابر نے مسجد میں تبدیل کر دیا

یہ معاملہ صرف تاریخی اور علمی حقائق کو ہی جھٹلانے کے برابر نہیں بلکہ ہندو مذہب میں "مقدس اوتار" یعنی بھگوان کے جنم لینے کا جو تصور ہے، اس کے بھی خلاف ہے۔

یہ کہنا کہ شری رام چندر جی، اجودھیا میں پیدا ہوئے اس بنیادی تصور اور مذہبی عقیدے کے بھی خلاف ہے جس پر ہندو مذہب کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔

"رامائن" کا جو دور ہے، اس دور میں اس کرہ ارض پر ممالک کی تقسیم کا نظام آج سے قطعی مختلف تھا۔ افریقہ اور جنوبی امریکہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے اگر ہم کرہ ارض کا نقشہ لیں اور اس میں ان براعظموں کو کاٹیں اور پھر ایک دوسرے سے جوڑیں تو دونوں جڑ جاتے ہیں گویا وہ ایک دوسرے کا حصہ ہیں یا یہ کہ کوئی خلا تھا جو پُر ہو گیا۔

آسٹریلیا کو اس وقت آندھرالیہ کہا جاتا تھا (یعنی اندھیرے کا گھر) یا تاریک براعظم جو بحر غاسکر اور سری لنکا سے جڑا ہوا تھا۔

جزیروں کا ایک تسلسل قائم تھا سونے کی کان افراط تھی حتیٰ کہ رامائن میں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ سری لنکا میں محلات و مکانات سونے کے بنے ہوئے تھے جنوبی امریکہ میں ایک عظیم تمدن کے نقوش ملتے ہیں جو اس وقت تہذیب و تمدن کا نقطۂ عروج تھا اور اس تہذیب و تمدن کے آثار و باقیات اب بھی ملتے ہیں۔ اس تہذیب کو تاریخ میں مایا تہذیب سے پکارا گیا ہے۔

مہابھارت کے دور میں راجہ یدھشٹر کے محل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کسی مایا نے ہی بنوایا تھا۔

یونان میں ہومر نے ایک زبردست و طویل رزمیہ نظم لکھی تھی اس کا نام یا عنوان "ایلیڈ" تھا ہم اگر اس رزمیہ نظم پر ایک نظر ڈالیں تو پھر "رامائن" اور اس میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا بلکہ اس میں زبردست مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ دونوں ہی طویل رزمیہ بیانیہ نظمیں ہیں۔ دونوں ہی کے ہیرو دو بھائی ہیں جو آپس میں انتہائی محبت کرتے ہیں اور جنہیں ان کے والد نے "بن باس" دیا ہے "ایلیڈ" کا ہیرو مینیلس اپنی دلہن ہیلن کو ایک مقابلہ میں جیتتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے رام چندر جی نے سوئمبر میں سیتا جی کو جیتا تھا۔ سوئمبر ایک طرح کا مقابلہ ہی ہے۔

سیتا ہی کی طرح ہیلن کا بھی اغوا ہوتا ہے اور ہیرس نامی مقام پر رکھا جاتا ہے، جس کے متعلق بیان ہوا ہے کہ وہ سونے کا مقام ہے بالکل ویسے ہی جیسے سونے کی لنکا کا ذکر ملتا ہے "ایلیڈ" کی لنکا کو "ٹرائے" کا نام دیا گیا ہے جو ایک جزیرہ نما پہاڑی علاقہ ہے۔ رامائن میں جس لنکا کا ذکر ہے اس میں بھی راون سیتا کو بھگا کر جزیرہ نما لنکا کے ایک پہاڑی علاقہ پر لے جاتا ہے۔

ہے۔ مسجد میں مورتی رکھے جانے کے خلاف اپکھے بربھچاری نے آمرن انشن بھی رکھا تھا، ہنومان گڑھی کے مہنت ابھے رام داس نے ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو خود اس بات کا انکشاف کیا تھا کہ انہوں نے اپنے چیلوں کے تعاون سے ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں رام اور سیتا کی مورتی مسجد میں رکھوائی تھی، فیض آباد میں تعینات کلکٹر کے کے نیر نے مہنت جی کو اس کام میں تعاون دیا تھا اپنے اسی کارنامے کی وجہ سے کے کے نیر کو ہندو فرقہ پرستوں میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ بہرائچ سے ایم۔ پی کا الیکشن جیت گئے ہیں ان کی بیوی سوشیلا نیر بھی اسی علاقے سے کئی بار ایم۔ ایل۔ اے ہوئیں۔

جس مسجد میں گووند ولبھ پنت کے دور حکومت میں تالا لگایا گیا اور جس کا مقدمہ ۳۵ برسوں سے عدالت میں چل رہا ہے اس کی ملکیت کا تصفیہ ہوئے بغیر اس میں ایک فرقہ کو داخلہ کی اجازت دے کر ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہونے کا موقع کیوں دیا گیا، نصف درجن رام جانکی رتھوں کو ملک کے مختلف علاقوں کو آزادانہ طور پر گھومنے اور فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے کی چھوٹ کس کے اشارے پر دی گئی، آر ایس ایس، شیوسینا، وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل کے لیڈروں کو زہر افشانی کا موقع کیوں فراہم کیا گیا، کیوں نہیں ان لوگوں کے خلاف کارروائی کی گئی، جب کہ حکومت کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس طرح کی چھوٹ امن و امان کے لئے خطرناک ثابت ہو گی

امن و امان کو خطرہ لاحق نہ ہو اس کے لئے حکومت سپریم کورٹ کے حکم کی تعمیل میں مجبوری ظاہر کرتی ہے، جب کہ دو شیعہ سنی مقدمہ کے فیصلے سے واضح ہے جب کہ یہ صرف مسلمانوں کے دو فرقوں کے بیچ کا معاملہ ہے لیکن جو مسئلہ پوری دنیا کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الجھا سکتا ہو اس کو صوبائی حکومت نے معمولی سمجھ کر کیسے نظر انداز کر دیا اور سرکاری وکیل نے اور صوبائی حکومت نے تالا کھولے جانے کے سول جج کے فیصلے کے خلاف حکم امتناعی کیوں نہیں حاصل کیا۔ وشو ہندو پریشد کے صدر سابق جسٹس شیو ناتھ کاٹجو، گورکھ ناتھ مندر کے مہنت اویدناتھ، وزیراعلیٰ اتر پردیش شری ویر بہادر کے آپس میں تعلقات ہیں۔ سرکاری وکیل، جج، اور ضلع انتظامیہ، اور ادمیش چندر پانڈے کا اس میں کیا رول رہا، ان سب واقعات کی سپریم کورٹ کے جج کے ذریعہ تحقیقات کرائی جائے اور مسجد و مندر کی ملکیت کا تصفیہ جنوبی ہندوستان کے ہائی کورٹ کے دو ججوں کے ذریعہ فوراً کرایا جائے تاکہ ملک میں مزید کشیدگی پیدا نہ ہو۔

بابری مسجد کے متعلق ثبوت فراہم کرنے کے لئے فیض آباد گزیٹیئر، فیض آباد کے سیٹل منٹ کمشنر پی کارنی کی تصنیف ہسٹوریکل اسکیچ آف فیض آباد ۱۸۷۰ء کا مطالعہ ضروری ہے اس کے ثبوت فیض آباد کے سرکاری ریکارڈ روم سنی سنٹرل وقف بورڈ لکھنؤ کے دفتر میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں لندن کے انڈیا آفس میں بھی اس کی بابت فرمان دیکھے جا سکتے ہیں، مسجد کا فارسی کتبہ خود ہی اس کی شہادت کے لئے کافی ہے جہاں تک مسلمان بادشاہوں کی حکومت کا سوال ہے، محمد غوری کے عہد ۱۱۹۲ء سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے دور، ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں نے اس ملک پر سیکڑوں سال تک حکومت کی ہے اگر یہ لوگ واقعی مندر شکن اور ہندو مذہب کے دشمن ہوتے تو ایک بھی قدیم مندر آج ہمیں دیکھنے کو نہ ملتا، مندر توڑے جانے کا الزام ان بادشاہوں پر بہتان تراشی ہے۔ اس کے برعکس مندروں کی تعمیر اور ان کے رکھ رکھاؤ کے لئے ان بادشاہوں کے جاری کردہ فرمان آج بھی مختلف مندروں کے مہنتوں کے پاس دیکھے جا سکتے ہیں۔

تحفظ شریعت نمبر کے بعد معتمدو النقیب کی ایک اور پیشکش

اتحاد ملت نمبر

ملت اسلامیہ کا اتحاد مسلمان ہند کی ایک دیرینہ آرزو ہی نہیں ان کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر وقفہ وقفہ سے اتحاد کی کوششیں بھی ہوتی رہی ہے۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ یہ کوششیں نہ صرف یہ کہ بار آور نہیں ہوئیں بلکہ ان سے افتراق و انتشار کی ہوا کچھ تیز ہوئی۔ اس کے اسباب اور اتحاد کی صحیح راہ کی نشاندہی کیلئے پچاس سے زائد علماء، اکابرین اور دانشوروں کو اس موضوع پر اظہار خیال کی دعوت دی گئی ہے۔

اس کے ساتھ ہی عوامی جذبات و احساسات کی عکاسی کیلئے ایک تحریری مذاکرہ بھی

اس میں شریک مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے حضرات تین سوالوں کا جواب دے رہے ہیں

۱۔ اتحاد و اتفاق کی کوششیں بار آور نہ ہونے کے اسباب؟

۲۔ مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ کیا ہے؟

۳۔ اتحاد کے حصول کی ممکن اور قابل عمل راہ۔ آپ بھی ان سوالوں کا جواب بھیج کر اس مذاکرہ میں شرکت کر سکتے ہیں۔

"اتحاد ملت نمبر" مارچ میں شائع ہو گا۔ تین روپیہ کا ڈاک ٹکٹ بھیج کر اپنی کاپی محفوظ کرائیں ایجنٹ حضرات پیشگی رقم ارسال فرمادیں۔

منیجر — نقیب پھلواری شریف پٹنہ

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام

تین چار ہفتے پہلے، جب جیالے جواں بخت راجیو گاندھی نے طلاق شدہ عورتوں کے نان نفقہ کے تعلق سے نیا مسودۂ قانون پارلیمنٹ میں لانے اور منظور کرانے کی نیت ظاہر کی، قومی پریس میں ہر ایک ایرے غیرے کے مخالفانہ بیان کو اچھالا جانے لگا۔ اور شور مچ گیا کہ اگر سپریم کورٹ کے فیصلے اور مشورے پر عمل نہ ہوا اور مسلمانوں کی [جاہل، تنگ نظر] اکثریت کو یا اس کے ترجمانوں ["ملاؤں"] کو ذرا بھی چھوٹ دی گئی تو ملک میں پھر بٹوارے کی طاقتیں زور پکڑ جائیں گی، قومی یک جہتی کی عمارت سب کچھ کیا کرایا خاک میں مل جائے گا، قومی مفاد ہمیشہ کے لئے کچل جائے گا۔

اگر یہ جملے وشو ہندو پریشد کے سکریٹری موہن لال نے یا ان جیسوں نے کہے ہوتے تو ہمیں کیا شکایت! دکان کا سائن بورڈ ہی بتانے کو کافی تھا کہ اندر کیا مال بکتا ہے۔ لیکن سپریم کورٹ کے سابق جج کرشنا آئیر نے جو اس بل (مسودۂ قانون) کی مخالفت میں آگے آگے رہے بعض قابل ذکر اخبار اور اڈیٹر بھی اچک اچک کر ایسی ہی ہذیانی ہانک لگا رہے ہیں۔

فی الحال ایسا نظر آتا ہے کہ قومی پریس ایک دم بیدار ہو گیا ہے، قومی ہستیاں چونک اٹھی ہیں، رستم پارہ کے بجائے انہیں اصلی چور، اصلی مجرم بھی، پارلیمنٹ کے آس پاس مل گیا ہے۔

ہم نے اپنی مادر وطن کی چوٹی نہیں چرائی، نہ تقسیم ہند کی حمایت کی، نہ اس ہولناک ٹریجڈی میں کوئی رول کیا ہے اگر تاریخ ہند کے اس خونی باب سے ہمارا کوئی رشتہ ہے تو صرف اس قدر کہ اپنے دور و نزدیک کے عزیزوں اور ہم وطنوں کی زخمی میراث کے امانت دار ہیں، اس امانت کو در دمندی سے سنبھالے ہیں۔ جب کوئی ایجنسی ہماری طرف منہ کر کے "تقسیم ہند" کی دہائی دینے لگے تو ہم اس کا گریبان اور طعنوں کی زبان پکڑ لیں۔ ہمیں، ہماری موجودہ نسل کو جو ناکردہ گناہوں کی سزا پا رہی ہے، اس کا پورا حق پہنچتا ہے۔ اسی حق کے بل پر ہم نیشنلزم اور انٹر نیشنلزم کے بلند بانگ دعویداروں سے سرعام سوال کرنا چاہتے ہیں:

★ گاندھی جی کے سمدھی راجگوپال آچاریہ (راجہ جی) نے ۴۵–۱۹۴۴ء میں اپنی دور اندیشی یا ضمیر کی آواز کے زور پر تقسیم ہند کے مطالبے کی تائید کی، مطعون ہوئے، مردود ٹھہرے — اور پھر آزادی کے بعد آزاد ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل چنے گئے۔

★ بابا صاحب امبیڈکر نے ایک زمانے تک مسٹر جناح کی ہمراہی اور ہم خیالی جاری رکھی، یہاں تک کہ عام جلوس میں بھی وہ ساتھ ساتھ نکلتے اور زندہ باد کے نعرے ساتھ وصول کرتے تھے۔ آج وہی ڈاکٹر امبیڈکر ایک قومی ہیرو ہیں۔

★ تامل ناڈو میں یکے بعد دیگرے کئی الیکشنوں کے دوران مرکزی حکومت ہند سے آزادی کے نعرے نے کانگریس کے مخالف امیدواروں کو جتوایا۔ اور الیکشن کی تقریروں میں تامل ذمہ داروں نے کھلے لفظوں میں یہاں تک کہہ ڈالا کہ وہ جنوبی ہند کی ریاستوں کا ایک بااختیار فیڈریشن بھی بنا سکتے ہیں۔

★ کیرالا، تامل ناڈو اور کرناٹک میں صوبائی خود مختاری کے جذبات کہاں کس درجہ حرارت تک پہنچ جاتے ہیں — خفیہ ایجنسیوں اور اخبارنویسوں سے زیادہ بھلا کسے خبر ہو گی!

★ آندھرا میں NTR (راما راؤ) کی ساری کامیابی اور کانگریس حکومت کی شکست کا راز یہی ہے کہ آندھرا اپنے ریاستی وقار اور اقتدار کو مرکز سے منوانا چاہتا تھا، اور بار بار کی تذلیل سہنے کے بعد وہ باقی ہندوستان سے الگ اپنی پہچان کرانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ سو اس نے کرا لیا۔

★ پنجاب میں دو تین سال سے جو افراتفری اور خون خرابہ، دہشت گردی کی درازدستی پھیلی ہوئی ہے اس کی روشنی میں، بلکہ تاریکی میں پنجاب کا مستقبل دھندلا گیا ہے اور پنجاب کی خود اختیاری پر نہیں، اس خود اختیاری کی شرطوں اور حدوں پر مول تول ہو رہا ہے۔

★ کشمیر کی وادی میں گھومتی ہوئی اقوام متحدہ UNO کے آبزرورز اور نگرانوں کی سفید کاریں ہر ایک سیاح کو جتاتی رہتی ہیں کہ ابھی آخری فیصلہ ہونا ہے، سرحدوں پر آخری نشان لگنے باقی ہیں۔

★ بنگال، تری پورہ اور شمال مشرق کی سرحدی ریاستیں آج بھی خود کو باقی ہندوستان میں پوری طرح سمویا ہوا شمار نہیں کرتی ہیں۔

★ یہ تو علاقائی تفرقے ہیں جنہیں قومی یکجہتی اور اتحاد کے کسی چھومنتر سے دور نہیں کیا جا سکتا؛ نہ وہ دس دو سو برس میں پیدا ہوئے ہیں، نہ دس بیس برس میں جانے والے ہیں۔ ان کی علاحدگی پسندی کی جڑیں اتنی ہی گہری ہیں جتنی ہمالہ تا کیرالا بھارت ماتا کے ایک اور اٹوٹ ہونے کی حقیقت گہری ہے۔

اس کے علاوہ نسلی اختلافات ہیں۔ اونچی نیچی جاتیوں کے درمیان — قانونی نہیں، سماجی دیواروں کا رفتہ رفتہ گھٹنے کے بجائے بڑھنا۔ نیچ ذاتوں کے تازہ ترجوان لہو میں تیز تر ہوتا تنفر کا جذبہ، کہ اگر قانون اسے ٹھنڈا کرنے کی ایک تدبیر کرتا ہے تو اینٹی ریزرویشن Anti reservation کے حامی "اونچی ذات" والے اسے دگنا دہکا دیتے ہیں۔

از امرتسر تا تری وندرم، ہر ایک علاقائی، نسلی، تہذیبی اور طبقاتی گروہ اپنی الگ پہچان اور اس پہچان کے اعلان پر اصرار کر رہا ہے — یہاں تک کہ اس سمت سے "ہرا رنگ" بھی کانوں میں پڑ رہا ہے۔ سب ایک دوسرے کے گلے میں مالا پہناتے ہیں قومی ایکتا کی — اور اتار کر رکھ دیا جاتا ہے اسے علاقائی الماریوں میں۔

اس نفسانفسی میں، چھوٹے چھوٹے تعصبات کی آپا دھاپی میں آبادی کا وہ کون سا حصہ، کون سا طبقہ ہے، جو ذات، نسل، رنگ اور علاقے کی تفریق کی دلدل میں دھنسا ہوا نہیں؟

وہ ہے ہندوستانی مسلمان۔ یہی "غریب، جاہل، تنگ نظر اور بنیاد پرست (Fundamentalist) مسلمان" — کہ اس کا اشرافیہ تو "مملکت خداداد" کی طرف کوچ کر گیا، درمیانی طبقہ مالی اور سماجی حیثیت سے محروم ہوتے ہوتے بالکل کھوکھلا ہو گیا، سرکاری عملداری سے اس کا وجود پرانے نام رہ گیا، ابھرتے ہوئے جوانوں کا صدیوں پرانے آبائی پیشوں میں عمل دخل نہیں رہا اور نئے سائنسی پیشوں کی ترغیب نہیں ملی، یہی ہندوستانی مسلمان ہے — جو از ہمالہ تا کیرالا کسی خطے کی جدائی کا طلب گار ہو سکتا ہے، نہ جدا ہونے سے سرسبز ہو سکے گا۔

اگر وہ کسی شہر، کسی بستی میں، پرانے محلوں کی گندگی سے نکل کر آج بھی نئی کالونیوں میں بسنا چاہے، کاسموپولیٹن فضا میں اپنی اگلی نسل کو پالنا چاہے، کاروباری معرکوں میں اترنا چاہے تو کسی دن کسی انجانے لمحے میں اس کا گھر بار خطرے کی زد میں آ جاتا ہے۔ معاشی مقابلے اور روزگار کی تنا تنی کوئی بھی ہیجانی روپ بھرے (مثلاً احمد آباد کا اینٹی ریزرویشن ایجی ٹیشن) — اسے ہاتھ کی صفائی سے مقامی مسلم آبادی کے خلاف موڑ دیا جاتا ہے۔

★ قومی ایکتا کے ہر رنگ نقشے پر جا بجا علاقائی پارٹیوں کے رنگ پھیلتے اور حاوی ہوتے جاتے ہیں، کسی بھی رنگ کے پرچم تلے سہی لیکن علاقائی طاقت اور اہمیت جتانے والی پارٹیاں آدھے ہندوستان پر راج کر رہی ہیں

آج کے ان حالات میں بھی ہندوستانی مسلمان ہے جو ایک بلند فصیل اور امید گاہ ثابت ہو سکتا ہے ملک کے قومی اتحاد اور ایکتا کی حفاظت کے لئے۔ قومی اقبال مندی اور قومی بدنصیبی — دونوں حالتوں میں وہ ایک بھروسے کے قابل پشت پناہ بن سکتا ہے۔ مذہبی پس منظر کے علاوہ غریبی اور احساس محرومی بھی اسے جوڑے ہوئے ہے۔

اب اگر وہ اپنی پیچ در پیچ مادی شکایتوں، سماجی تکلیفوں اور ذہنی اذیتوں کو نرم گرم الفاظ میں، اپنی پنچایتی لب و لہجہ میں، ڈرائنگ روموں اور بیٹھکوں کے سناٹے میں سر عام سنانا چاہے، کچھ پرانے نام کا جنوں ہی بہلانا چاہے تو فوراً قومی پریس اور نام نہاد روشن خیال پرستش گاہوں کو ہندوستان کی ایکتا کے لئے خطرہ دکھائی دینے لگتا ہے، وہ پچھلے بٹوارے کی یاد دلا کر قوم کو ایک اور بٹوارے کا ہوا دکھلاتے ہیں۔ (media) نشر و اشاعت کا سوچ بچار ان خوش حال اور خوش خیال حضرات کے ہاتھ میں ہے۔ تنگ ظرف کراڑ سے کہتا ہے کہ یہ دیکھو مسلمانوں کا ایک بٹوارے سے جی نہیں بھرا — پھر سازش کر رہے ہیں۔

پارلیمنٹ میں جو مسودہ قانون مطلقہ کے نان نفقہ کی بحالی کے سلسلے میں آیا ہے، وہ ملک کی ایک لاکھ آبادی میں صرف ۲ نفر کو چھوتا ہے — ایک لاکھ میں دو، سو اور — نہ یہ مسلمانوں کی حیات و موت کا مسئلہ ہے، نہ قوم کی ایکتا یا بگاڑ کا۔ بڑا معمولی سا سماجی مسئلہ ہے۔ اگر آگے کے بجائے پیچھے کی طرف ایک قدم ہی شمار ہو تو زندگی کے اور کئی مناظر میں تو پیچھے کی طرف کئی قدم اٹھ چکے ہیں، قوم نہ بکھر گئی — نہ مر گئی — نہ مرنے والی ہے۔

ہزار عذابوں سے گزر کر یہ سکڑتی ہوئی، سمٹی ہوئی قوم، پچھڑی ہوئی قوم جی رہی ہے اور قومی پریس کے آسیب کے باوجود یکجان اور ثابت قدم ہو رہے گی۔

(انقلاب حیدرآباد۔ جمعرات ٦ر مارچ ١٩٨٦ء)

بقیہ اداریہ صـــ ســـے آگے

کی پرورش کرتی تھی آج میری کوئی خبر گیری کرنے والا نہیں، اب تو کسی کے در پر بیٹھ کر کھا لیتی ہوں، کئی بار تو جانوروں کے ساتھ بھی، ابھی وہ جانوروں کی بات کر رہی تھی کہ اس سے ایک گز کے فاصلہ پر ایک کتا کٹورے میں پڑی ہوئی اس کی روٹی لے کر بھاگ گیا۔ ہے

بل کے خلاف ہنگامہ کرنے والے یہ لوگ اپنے گریبان میں منہ کیوں نہیں ڈالتے ہمارا ملک اس وقت گراوٹ کی اس منزل کو پہنچ گیا ہے کہ بیٹا اپنے باپ کو قتل کر کے اس کا خون پی رہا ہے بلکہ قتل و خونریزی عام ہو چکی ہے، شاید ہی کسی دن کا اخبار عورتوں کے جلانے کی خبر سے خالی ہوتا ہو، علاقائی کشمکش فرقہ وارانہ فسادات ہی نہیں بلکہ اس کی آگ کو بھڑکانے کے لئے مستقل تحریک چل رہی ہے جو کسی وقت بھی ملک کو آگ میں جھونک سکتی ہے اس کا انہیں کوئی فکر نہیں، ان کی ساری ہمدردیاں مسلم مطلقہ کے ساتھ ہو گئی ہیں اور اس بل کے خلاف برسر پیکار ہو گئے ہیں جو مطلقہ کے لئے ہر طرح کی سہولت مہیا کر رہا ہے اس کو ہم تعصب کے جنون کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں۔

قابل مبارکباد ہیں وزیر اعظم جنہوں نے گہرائی میں جا کر مسئلہ کا جائزہ لیا اور حقیقت عیاں ہو جانے کے بعد تعصب و فرقہ پرستی کو بالائے طاق رکھ کر کانگریس پارٹی کے اصولوں میں ایک مضبوط کیل ٹھونک دی اور یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس اب اپنی کھوئی ہوئی قدروں اور اصولوں کو پھر سے زندہ کرے گی اور ملک کے سیکولر نظام کو باقی رکھنے کا پورا سامان مہیا کر کے اقلیتوں کا دل جیت کر ملک کو امن و سلامتی کے راستہ پر لے جائے گی جسے یہ متعصب، فرقہ پرست اور خود غرض لوگ کسی طرح نہیں پسند کرتے ان کو ملک کی نہیں اپنی فکر رہتی ہے۔

ـــــــ

لہ قومی مورچہ بنارس لہ قومی آواز۔

ہماری مشکلات کا حل کیسے ہو؟

از:- سعید الرحمن اعظمی ندوی
مترجم:- اکرام مجیب ہاشمی

اس وقت کا پیچیدہ ترین اور عالم گیر مسئلہ جس نے عقل انسانی کو حیران کر رکھا ہے وہ ہے امن و سلامتی کا مسئلہ۔ کیونکہ انسانوں کی زندگی وسائل کی کثرت علم و تہذیب و اختراع نیز تسخیر کائنات کے باوجود خوف و ہراس اور مصائب و آلام سے محفوظ نہیں، یہ حقیقت ہے کہ اسے مال و دولت خوشحالی اور آسائش زندگی کا پورا سامان حاصل ہے لیکن اچانک بے سان و گمان پیش آنے والے حوادث کا خوف ہر وقت انکی زندگی کو اجیرن بنائے رہتا ہے۔

اس وقت کچھ لوگ غایت درجہ کے متمول اور صاحب ثروت اور کچھ غیر معمولی طور پر محفوظ و مامون سمجھے جاتے ہیں اور تیسرے وہ لوگ جنہیں دور جدید کے تمام تحفظ و سالمیت کے وسائل میسر ہیں۔ لیکن نہ تو انہیں حقیقی امن و سکون کی زندگی نصیب ہے اور نہ ہی لطف و راحت کی انکی کوئی آرزو پوری ہو پاتی ہے، بلکہ خوف و ہراس کی گھڑیاں ہمیشہ ان پر مسلط رہتی ہیں اور قلق و اضطراب کے لمحات رہ رہ کر انہیں جھنجھوڑتے ہیں حتیٰ کہ امن کے ذمہ داروں اور عوام کے ہر طبقہ میں حفاظتی احکام جاری کرنے والوں اور اس محکمہ کے کارکنوں کے جان و مال تک خطرے میں ہوتے ہیں اور یہ کسی ملک و معاشرہ میں امن و سلامتی ختم ہو جانے کا آخری درجہ ہے۔

یہی نہیں بلکہ دنیا کی سب سے ترقی پذیر حکومت جو امن و سلامتی کے وسائل کی ایجاد و اختراع میں پیش پیش ہے۔ وہاں بھی لوگوں کے جان و مال اور انکی عزتیں محفوظ نہیں اور وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں ہر وقت خوف و ہراس قلق و اضطراب سے دوچار رہتے ہیں۔

اس وقت زندگی کے تمام شعبوں میں ناانصافی لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ ہے لوٹ مار ڈاکہ زنی انسانوں اور ہوائی جہازوں کا اغوا یہ سب ایسی حقیقتیں ہیں جو روزمرہ کا معمول بن گئی ہیں یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان زندگی کی تمام لذتوں سے محروم اور امن و سکون کی دولت سے تہی دست ہے، انسانوں کی جاہ و دولت اور خوشحالی

و خوش عیشی ان مشکلات کا حل پیش کرنے میں بے سود ثابت ہوئی جو غیر متوقع دناگہاں حوادث کی شکل میں ان کا عرصۂ حیات تنگ کئے رہتے ہیں اور انہیں ہمیشہ عذاب دنیا ہی میں گرفتار رکھتے ہیں اور ایک غیر معمولی آفت و مصیبت بن گئے انکے سروں پر منڈلایا کرتے ہیں، حالانکہ زندگی کی بحالی اور اس صورت حال کا قلع قمع کرنے کے لئے غیر معمولی اہتمام و توجہ ہے اور اب اسمیں کوئی شبہ نہیں کہ یہ مسئلہ اپنی پیچیدگی اور ہمہ گیری میں ساری دنیا پر مسلط ہے اور انکی سنگینی رفتار زمانہ کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

یہ مسئلہ کی روح و جوہر کے ساتھ قدیم جاہلی معاشروں میں بھی موجود تھا اگرچہ اسکی شکلیں اور خد و خال کچھ مختلف تھے لیکن پیغمبر اسلام کی دعوت و توجہ سے مشکلات کے بادل چھٹ گئے اور انسان کا مقام بلند ہو گیا اور یہ اس وقت ہوا جبکہ عبد و معبود کے تعلق کو واضح اور خدا کی ذات کا ہمہ وقت استحضار اور دلوں میں ہمیشہ انکی یاد تازہ رکھی گئی، اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سے ڈرنے اور اس کا پاس و لحاظ کرنے کی دعوت دی اور انسانوں کو یہ احساس دلایا کہ خدا کی ذات زندگی ہر عمل و حرکت میں ہر آن و لمحہ انکی نگراں ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے اپنی زندگی کو تقویٰ و للّہیت سے سنوارا تو ان سے ہر قسم کا خوف و ہراس جاتا رہا اور وہ ایک پاکیزہ خوشگوار پرمسرت زندگی گزارنے لگے جسکا ایک سرا آسمان سے جڑا تھا اور دوسرا زمین سے جب کبھی انکی زندگی میں کسی کام و کاوش کے لئے حرکت پیدا ہوتی تو پردۂ غیب سے تائید و رہنمائی اور تکمیل کا سامان ہوتا۔

بیشک اسلامی تعلیمات میں انسانی زندگی کی تعمیر اور ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کا بہترین علاج موجود ہے اور اس عقدہ لاینحل کا اصل علاج مشیت الٰہی اور کثرت کا سچا تصور ہے اور یہی اس عالمگیر مسئلہ کا واحد علاج ہے جس نے ساری دنیا کو بے چینی و بے قراری کے عذاب میں مبتلا کر رکھا اور انکے فوری حل کی تلاش و جستجو میں اہل دنیا کو برسرپیکار کر رکھا ہے۔

یقیناً اسلام نے ایسی مشکلات کے حل اور ان پر قابو پانے کے لئے جو لازوال طریقہ علاج پیش کیا ہے سہل اور آسان طریقہ ہے اور اسی سے انسانی زندگی ہر طرح کی امن و سلامتی سے مالامال ہو سکتی ہے، کاش کہ آج کی دنیا اس طریقہ کو آزمائے۔ ••

وزیر اعظم راجیو گاندھی کے جرأت مندانہ اقدام کی حمایت

مونگیر۔ ۱۱ مارچ۔ شریمتی سدھا اگروال ایڈوکیٹ سمیت مونگیر کے ۳۱ ممتاز اور سرکردہ قانون دانوں نے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں۔ ایک دستخطی بیان میں مطلقہ خواتین کے حقوق و مفادات کے تحفظ کیلئے وزیر اعظم راجیو گاندھی کے جرأتمندانہ اقدام پر ان کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے اس ترمیمی بل کی پرزور حمایت کی ہے جو پارلیمنٹ میں منظوری کیلئے حکومت نے پیش کیا ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ یہ بل نہ صرف سیکولر اور جمہوری روایات کے عین مطابق ہے بلکہ دستور ہند میں اقلیتوں کو فراہم کی گئی تحفظات سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ دستخط کنندگان نے وزیر اعظم کو اپنی مکمل حمایت پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ ان کا یہ کارنامہ سیکولر ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا۔ بیان پر دستخط کرنے والوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

اظہار الحق ایڈوکیٹ، صدر ٹی سی مونگیر، ایم شمیم احمد ایڈوکیٹ، ایم اے رحمان ایڈوکیٹ، محمد زبیر احمد ایڈوکیٹ، ایم شرف الدین رسولی ایڈوکیٹ، ایم رشید ایڈوکیٹ، شیخ عالم ایڈوکیٹ، آنند موہن سہائے ایڈوکیٹ، رتن دیو یادو ایڈوکیٹ، چندر بھوشن سنگھ ایڈوکیٹ، رضی اے صدیقی ایڈوکیٹ، بستی لال ایڈوکیٹ، سید امام رضا ایڈوکیٹ، طٰہٰ عاشق ایڈوکیٹ، وصی احمد ایڈوکیٹ، نند لال ساہ ایڈوکیٹ، سریش چودھری ایڈوکیٹ، پریم ناتھ پانڈے ایڈوکیٹ، مدن گوپال مصرا ایڈوکیٹ، رام شرن پرشاد ایڈوکیٹ، راج کشور پرشاد ایڈوکیٹ، صدر آل انڈیا ترجمن یوک سنگھ مونگیر۔ محمد ظہیر عالم ایڈوکیٹ، اس اے رضوی ایڈوکیٹ، محمد احمد ایڈوکیٹ، اردن دیو سہائے ایڈوکیٹ، کرشنا پرشاد سنہا ایڈوکیٹ، محمد عبد الباری ایڈوکیٹ، شریمتی سدھا اگروال ایڈوکیٹ۔

نیاز احمد رحمانی
آفس سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ مونگیر

دانش گاہ اسلامیہ کا یوم تاسیس

دانش گاہ اسلامیہ آسنسول کا سولہواں یوم تاسیس ۱۰ فروری ۱۹۸۶ء کو منایا۔ اس میں بزم اقبال کے تینوں گروپ، اے۔ بی۔ سی میں کامیاب ہوئے طلبہ اور ۱۹۸۰ء کے سالانہ امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئے طلبہ اور صفائی ستھرائی اور اوسط حاضری میں فائق طلبہ اور اسپورٹس میں حصہ لینے والے طلبہ میں انعامات تقسیم کئے گئے۔ تقسیم انعامات الحاج جناب عبد الستار کے ہاتھوں انجام پایا۔

اس جلسہ میں جناب الحاج ضیاء الحسن صاحب سکریٹری جنرل مسلم ایجوکیشنل سوسائٹی نے اقبال کی شخصیت، اور دانش گاہ اسلامیہ کے شعبہ عربی کے استاد مولانا خالد حسین ذاکر ندوی نے بزم اقبال کا تعارف پیش کیا اول الذکر مقالہ نگار نے اپنے مقالہ میں فرمایا کہ اسلام کی گرتی ہوئی حالت کو سنبھالنے کے لئے لوگوں کی نظر انتخاب اس ہونہار شاعر پر پڑی جس کے درد مند دل نے اپنی شاعری کو ایک نسخہ کیمیا بنا کر مسلمانوں کو معاشرتی اور اخلاقی بیماریوں کے لئے پیش کیا۔ ان کے نسخہ کے اجزا میں مایوسی اور حسد کے بجائے ہمت افزائی اور خودداری ہے جس کو وہ مسلمانوں کے رگ و پے میں بسانا چاہتے ہیں۔

جناب حاجی عبد الرؤف صاحب ڈائریکٹر دانش گاہ اسلامیہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس عزم کا اعادہ کیا کہ جس بزرگ شخصیت حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے اس ادارے کی جدید عمارت کا سنگ بنیاد اپنے دست مبارک سے ۸ اپریل ۱۹۸۵ء رکھا تھا انشاء اللہ، اللہ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا۔ آپ نے مزید کہا کہ تعلیم کا مقصد طلبہ کی شخصیت کی تعمیر، زبان کی شیرینی و شائستگی ذہنی نشو و نما اور کردار و تعمیر سازی کے لئے ایسے ذرائع و وسائل مہیا کئے جائیں کہ ان کی شخصیت ابھرے اور وہ سچے مسلمان بنیں۔

اس جلسہ کی صدارت جناب سید حفیظ الرحمن ایم۔ اے علیگ نے کی اور مہمان خصوصی آسنسول کے کہنہ مشق شاعر جناب ادریس صدر تھے۔ جبکہ جلسہ کا آغاز قاری نیاز احمد کی تلاوت پاک سے ہوا تھا اور اس کے بعد پریم کشائی و ترانہ پیش کیا گیا تھا۔

بابری مسجد کی مکمل کہانی

مسز نیلوفر احمد

شمالی ہندوستان کا پورا علاقہ فرقہ وارانہ کشیدگی اور منافرت کی گرفت میں ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اجودھیا جس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ وہاں کوئی جنگ نہیں لڑی جا سکتی اس کے ایک بدبختانہ سانحہ نے پورے ملک کو بارود کے ڈھیر پر لا کھڑا کیا ہے۔ منافرت اور تشدد کی فضا سے ہمارے قومی استحکام اور ہماری جمہوری زندگی کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ رہا۔ ضرورت ہے کہ ہم یہ عزم کر لیں کہ ہم ایک دوسرے پر دشنام طرازی اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کے طریقہ کی روک تھام کریں گے جس کے بدترین سائے ہماری قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ اتحاد پر پڑ رہے ہیں۔ مذہبی رواداری اور خوشگوار ہمسائگی کا جذبہ رکھنے والے اگر آج ہی بیدار نہیں ہو جاتے تو ہو سکتا ہے کہ کل بہت دیر ہو چکی ہو۔

اجودھیا میں جو جھگڑا ہے وہ ایک ایسی مسجد سے متعلق ہے جو ۱۵۲۸ء میں تعمیر کرائی گئی تھی۔ مسجد کے پھاٹک پر جو کتبے کندہ ہیں ان میں سے ایک درج ذیل ہے۔

بفرمودۂ شاہ بابر کہ عدلش
بنائیست تا کاخ گردوں ملاقی
بنا کرد این مہبط قدسیاں را
امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی چو سال بنائش
عیاں شد کہ گفتم بود خیر باقی
۹۳۵ھ

ترجمہ:۔ بادشاہ بابر کے حکم سے جس کے انصاف کی بلندی آسمانوں تک ہے۔ سعادت مند امیر میر باقی نے ملائک کی اس درگاہ کی بنیاد رکھی۔ یہ نیک کام ہمیشہ باقی و جاری ہے۔ یہیں نے اس کی تاریخ "بود خیر باقی" (۹۳۵ھ) کہہ دی۔ یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس مسجد کو بابر کے ایک تاشقند نژاد امیر میر باقی نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مسجد تین حصوں پر مشتمل ہے اور ہر حصہ پر ایک گنبد ہے۔ اس مسجد میں بہت سے کتبے کندہ ہیں۔ مشرقی جانب ایک چھجہ ہے جس کے نیچے قرآنی آیات اور فارسی کا شعر کندہ ہے۔ اور درمیانی محراب پر کلمہ شریف وغیرہ کندہ ہیں۔

بابر اپنے حریف بایزید کے خلاف مہم کے سلسلے میں ۹۳۴ھ میں اجودھیا سے تقریباً دس میل دور ایک مقام پر خیمہ زن ہوا تھا۔ مہم سے فراغت کے بعد بابر دریائے شاردا کے برابر واقع جنگلات میں شکار کھیلنے میں مشغول ہو گیا تھا (بابر نامہ ترجمہ اے ایس بیورج پیرا ۴۲)۔ ایسا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ بابر اجودھیا میں داخل ہوا ہو اور وہاں شہر میں اس نے کوئی مسجد تعمیر کرائی ہو۔ ایسا بھی کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے کہ بابر نے یہاں کسی مندر کو منہدم کرایا ہو۔ بابر کی پوری زندگی میں مذہبی تعصب کا ایسا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ بیورج نے بھی جو بابر یا مسلمانوں کا کوئی دوست نہیں تھا۔ اس نے بھی ایسے کسی واقعہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا کہ بابر نے کسی مندر کو منہدم کرایا ہو۔ بابر کی سوانح حیات میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اس میں تعصب کا جوش تھا۔ اس کے برعکس ریکارڈ میں ایسے ثبوت موجود ہیں کہ وہ جن شہروں میں گیا تھا ان میں سے وہ اکثر شہروں کے مندروں میں بھی گیا۔ مثال کے طور پر بابر کے ایک مندر میں جانے کا واقعہ بابر نامہ سے ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

"وہ گھوڑے پر سوار ہو کر گوالیار کے بت خانوں میں گیا تھا۔ کچھ مندر دو منزلہ کچھ سہ منزلہ تھے۔ ہر ایک منزل کی چھت قدیم طرز پر بہت نیچی تھی۔ بہت سی ایسے چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے جیسے کہ مدرسوں میں ہوتے ہیں۔" عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر نے ان مندروں کو دلچسپی سے دیکھا تھا۔ بابر کے مزید سیکولر ہونے کا ثبوت اس کے اس وصیت نامے سے ملتا ہے جو اس نے اپنے بیٹے ہمایوں کے لئے لکھی تھی۔ اس وصیت نامے میں بابر نے لکھا تھا کہ

"...... تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم جانبداری (تعصب) سے اجتناب کرو۔ لوگوں پر عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرو۔ اپنی رعایا کا دل جیتنے کے لئے گائے کا گوشت کھانا ترک کر دو۔ ایسا کرنے سے وہ ہمیشہ تمہاری مملکت کے وفادار رہیں گے۔ مندروں اور لوگوں کی عبادت گاہوں کو کبھی منہدم نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح سے عدل و انصاف کرو کہ لوگ اپنے بادشاہ سے محبت کرنے لگیں۔ سنیوں اور شیعوں کے درمیان اختلاف کو نظر انداز کرو۔"

قومی آثار قدیمہ کے محکمے میں اس وصیت نامہ کی ایک نقل موجود ہے۔ بابر کے بیٹے ہمایوں نے بابر کی وصیت کے مطابق کام کرتے ہوئے اجودھیا کے قریب مرزا پور ضلع میں ۱۳۰ ایکڑ اراضی بنارس کے جنگم وادی مٹھ کو بطور امداد دی۔ حکم نامہ کی اصل مٹھ کے پاس آج بھی موجود ہے۔ یہ بھی تاریخ کی ایک ستم ظریفی ہے کہ مغل سلطنت کے اس شریف بانی پر اجودھیا کے پوتر مندر کو ڈھانے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔

یہ سب کیسے شروع ہوا

اودھ جو فارسی زبان میں اجودھیا کا ہی نام ہے وہاں واجد علی شاہ کے زمانہ میں مخلوط تمدن و ثقافت نظر آ رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کی بہت سی مذہبی تقاریب کو اپنا رہے تھے۔ ہولی مذہب و عقیدہ سے قطع نظر قومی تہوار کی حیثیت میں منائی جاتی تھی۔ اور ہندو محرم میں ماتم کرتے تھے۔ واجد علی شاہ نے خود بھی اس تمدن کو اپنایا اور اس کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا۔ انگریز جو اودھ پر قبضہ کرنے کا عزم کئے ہوئے تھے یہ بات ان کے حق میں نہیں تھی۔ انھوں نے ۱۸۵۵ء میں اجودھیا میں فرقہ وارانہ ہنگامہ کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ مولوی احمد اللہ فیض آبادی کی سرکردگی میں اجودھیا کے ہندوؤں اور مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے بغاوت میں اہم کردار انجام دیا۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد ان علاقوں کے لوگوں کو ۱۸۵۸ء میں بری طرح کچلا گیا۔ انگریز اپنی حکمرانی کے استحکام کے لئے دونوں بڑے فرقوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی مستقل خلیج قائم کرنا چاہتے تھے۔ اور تقسیم کرو اور حکومت کرو انگریز حکمرانوں کا فلسفہ بن گیا تھا۔ انتظامیہ نے بھی ان مکروہ مقاصد کو پورا کرنے میں مدد کی۔ ایسے ہی افسروں میں فیض آباد ڈسٹرکٹ گزٹ کا مرتب ایچ آر نویل بھی تھا پہلی بار اس نے اس گزیٹیر کے صفحہ ۱۷۳ پر لکھا۔

"۱۵۲۸ء میں بابر اجودھیا (اودھ) آیا اور یہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ اس نے قدیم مندر کو ڈھا دیا تھا (رام جنم بھومی مندر کو) اور اسی مقام پر ایک مسجد تعمیر کرائی جو اب تک بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس میں دو کتبے کندہ ہیں ایک باہر کی جانب اور دوسرا اندر۔ یہ کتبے فارسی میں ہیں اور ان پر ۹۳۵ھ کا سال کندہ ہے۔ یہ اس عمارت کی تعمیر کی تاریخ ہو سکتی ہے۔" اپنے اس بیان کے ثبوت میں اس نے کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا۔ اور اس بات کی بھی پرواہ نہیں کی کہ اس کا یہ بیان بابر نامے کے برعکس ہے۔ برطانوی افسر کی جانب سے سرکاری ریکارڈز میں یہ قیاسی اندراج مزید ثابت کرتا ہے کہ انگریزوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے کس طرح فرقوں کے درمیان کشیدگی پیدا کی اور عوام کے لئے ایک مستقل مصیبت پیدا کر دی۔

۱۸۸۵ء میں ایک مہنت رگھوبر داس نے دعویٰ کیا کہ مسجد کی عمارت کے باہر لیکن مسجد کے بیرونی احاطہ کے اندر واقع چبوترا رام جنم بھومی ہے۔ چبوترا بھی کچھ ہی دن پہلے بنایا گیا تھا۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دعویٰ اس چبوترے پر صرف ایک سائبان تعمیر کرانے کے مقصد تک محدود تھا اور اس دعویٰ میں مسجد شامل نہیں تھی۔ پنڈت ہری کشن سب جج نے چبوترے پر سائبان تعمیر کرنے کے لئے ہندوؤں کے دعوے کو خارج (مسترد) کر دیا۔ اس کے بعد اپیل کی سماعت کے دوران ڈسٹرکٹ جج نے موقع کا معائنہ کیا تھا اور اس نے اپنے فیصلے میں کسی قدر تفصیل سے لکھا۔

"اس احاطہ میں داخلہ کے لئے جس پھاٹک سے گزرنا ہوتا ہے اس پر لفظ "اللہ" کندہ ہے۔ اس کے فوراً بعد بائیں جانب چبوترا ہے جس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔ اس چبوترے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ رام جنم بھومی ہے۔" اس چبوترے پر سائبان تعمیر کرنے کے دعوے کو ڈسٹرکٹ جج نے ۲۶ مارچ ۱۸۸۶ء کو خارج کر دیا۔

آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کے ماحول میں مہنتوں نے توازن کھو دیا اور جانب دارانہ رویہ اختیار کیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے کے نائر نے جو برطانوی تربیت یافتہ اور ایچ آر نویل کے صحیح جانشین تھے اپنے آقاؤں کے گھناؤنے کھیل کو مکمل کر دیا۔

۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی صبح کو جب مسلمان فجر کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں پہونچے تو انھوں نے دیکھا کہ رام اور دوسرے دیوتاؤں کی مورتیاں مسجد کے اندر رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کام پولیس کی موجودگی میں اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے نائر کی سرگرم حمایت سے ہوا۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی صبح کو ۷ بجے کانسٹبل شری ماتا پرساد نے پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرائی کہ رام داس، رام شکل داس وغیرہ کا اس سازش اور لوگوں نے مسجد کے اندر مورتیاں رکھ کر مسجد کی بے حرمتی کی۔ اس تمام واقعہ میں اپنے رول کی بنا پر شری نائر کو مستعفی ہونا پڑا تھا۔ بعد میں نائر اور ان کی بیوی نے جن سنگھ کے امیدواروں کی حیثیت میں مختلف حلقوں سے پارلیمنٹ کا الکشن لڑا اور کامیاب ہوئے۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء سے مسجد مقفل رہی۔

سیول جج فیض آباد کی عدالت میں مقدمہ دائر چندر داس بنام ظہور احمد وغیرہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جے این اگروال نے جو حلف نامہ داخل کیا تھا اس کا کچھ حصہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے جس سے صحیح تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

"پیرا ۱۴۔ جس املاک کے متعلق مقدمہ ہے وہ بابری مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے اور ایک طویل عرصہ سے مسجد کے طور پر استعمال ہو رہی ہے اور مسلمان اس میں نمازیں ادا کرتے ہیں۔ اس کو رام چندر جی کے مندر کی حیثیت میں استعمال نہیں کیا گیا۔

پیرا ۱۵۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء کی رات میں شری رام چندر جی کی مورتیاں یہاں چوری چھپے رکھ دی گئیں۔

پیرا ۱۶۔ مذکورہ بالا غلط اقدام (مسجد میں مورتیاں رکھنے کا اقدام) کے نتیجے میں امن و قانون کے لئے خطرہ کا ماحول پیدا ہو گیا اور امن و قانون کے تحفظ کے لئے انتظامیہ کو مداخلت کرنی پڑی۔"

ان تمام واقعات کی تیرگی میں روشنی کی کچھ کرنیں بھی نظر آئیں۔ جس وقت اجودھیا میں پروپیگنڈہ زوروں پر تھا اس وقت ۱۹۵۰ء میں فسطائی طاقتوں کے مقابلہ میں کانگریس کے کچھ لوگ چٹان کی طرح کھڑے ہو گئے۔ فیض آباد ضلع کانگریس کمیٹی کے اس وقت کے صدر مسٹر سدھیشوری پرساد اور جنگ آزادی کے ایک سرگرم سپاہی اور یوپی پردیش کانگریس کمیٹی کے ممبر مسٹر اکشے برہمچاری جنہیں سیکولر اور جمہوری ہندوستان کے حق میں اس لڑائی میں شامل ہوتے۔ اکشے برہمچاری نے شری لال بہادر شاستری کے نام اپنے خط مورخہ ۱۳ جنوری ۱۹۵۰ء میں لکھا تھا کہ

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی کی جان کی قربانی کے بعد ہمارے اندر ان کے اصولوں کی جگہ ایک طرح کے خوف نے لے لی ہے۔ یہ میرا اٹل عقیدہ ہے کہ فرقہ وارانہ زہر کا خاتمہ کرنے کے لئے ہم کو مہاتما گاندھی کے طریقوں پر عمل کرنا ہوگا۔ اپنشد ہم کو تعلیم دیتے ہیں کہ اہنسا کے ذریعے غصہ پر فتح حاصل کرو، محبت سے نفرت کو شکست دو اور صداقت سے باطل کو جھٹلا دو۔"

اجودھیا کی فسطائی طاقتوں کے مقابلے میں اس اصولی موقف کے نتیجے میں اکشے برہمچاری کے مکان کو لوٹ لیا گیا۔ ان پر فرقہ پرستوں نے حملہ کیا۔ ان پر اور شری سدھیشوری پرشاد پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ مسلمان ہو گئے ہیں اور ہندوؤں کے مفادات کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ فرقہ پرستوں نے نہ صرف یہ کہ مقامی کانگریسیوں پر حملے کئے بلکہ پنڈت جواہر لال نہرو پر بھی ان کی سیکولر پالیسیوں کی بنا پر حملہ کیا۔ لوگوں میں سمجھداری جگانے کے لئے شری اکشے برہمچاری نے مرن برت رکھا۔ آچاریہ نریندر دیو نے جو اجودھیا میں پیدا ہوئے تھے اور ایک سرگرم سوشلسٹ لیڈر تھے سیکولرازم کے تحفظ اور اقلیتوں کے حقوق کی جنگ لڑی۔ ان کے خلاف بھی پروپگنڈہ کیا گیا کہ وہ ہندوؤں کے مفادات کے خلاف کام کر رہے ہیں اور فرقہ پرستوں نے الکشن کے دوران ان کے خلاف اتنے بڑے پیمانے پر پروپگنڈہ کیا کہ ان کو اپنی سیٹ سے محروم ہونا پڑا۔

بالمیکی کی راماین کا گہرا مطالعہ کرنے والا ہر عالم جانتا ہے کہ ان کی اجودھیا دریائے سرجو سے ڈیڑھ یوجنا کے فاصلے پر تھی۔ بالمیکی کے بیان کے مطابق یہ ندی ہمالیہ کی طرف بہتی ہے اور تھوڑے فاصلہ پر گنگا سے جا ملتی ہے۔ آج کی اجودھیا ٹھیک سرجو کے کنارے ہے اور سرجو سے ڈیڑھ یوجنا (کم از کم ۱۲ میل) دور نہیں ہے۔ مزید برآں یہ ندی ہمالیہ کی طرف نہیں بلکہ پورب کی طرف بہتی ہے اور پھر سرجو ندی گنگا میں نہیں ملتی بلکہ راجگی سے ملتی ہے جس کا قدیم نام چیراولی تھا۔ اتھروید اور ستاتھرا برہمنا کے گہرے مطالعے سے

یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ لفظ اجودھیا اسم معرفہ کے طور پر نہیں بلکہ صفت کی حیثیت میں استعمال ہوا ہے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی شملہ کے فیلو پروفیسر بی۔ بی۔ لال نے جو آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل بھی رہ چکے ہیں اس کا انکشاف کیا ہے کہ

ویدوں کی کسی ایک جگہ بھی لفظ اجودھیا اسم معرفہ کے طور پر استعمال نہیں ہوا اس سے یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

اور ارتقاء میں دولت آصفیہ اور حیدرآباد ریاست کا جو حصہ ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اور اسکی اہمیت کبھی بھی کم نہیں کی جا سکتی۔ جامعہ عثمانیہ، دارالترجمہ اس کے شاہد ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں بھی انگریزی اصطلاحوں کے بجائے اردو اصطلاحیں جاری کی گئیں۔ یہ خواہش کہ یہاں ایک ہی خاندانِ آصفیہ کی سلطنت رہے۔ جس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے اور جس کا بڑا احسان ہے، اور جس اپنی صلاحیت کے نقوش چھوڑے ہیں تو یہ سب خواہشات کے درجے میں تھیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ یہاں کی اکثریت غیر مسلم ہے اس کی زبان بھی اردو نہیں ہے اور اتنی جلدی وہ ہو بھی نہیں سکتی۔

یہ حقیقت تھی اس کو مدنظر رکھنا چاہیئے تھا۔ چنانچہ یہاں ایسے دور اندیش وزراء آئے جنھوں نے مشورہ دیا کہ اس ملک میں مسلمانوں کے اقتدار، ان کی عزت اور ان کے امتیاز کو باقی رکھنے کی دو ہی شکلیں ہیں۔ سعید امام جس وقت یہاں مدارالمہام بن کر آئے تو انھوں نے مشورہ دیا کہ ایک تو تبلیغ اسلام کی جائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی تعداد بڑھائی جائے۔ وہ دینی جذبہ اپنی جگہ۔ اصل محرک تو یہی ہونا چاہیئے لیکن سیاسی مصلحت بھی یہی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ باہر کے لوگوں کو آسانیاں دی جائیں۔ یہاں زمین خریدنے اور انھیں بسانے کی سہولت دی جائے۔ اس لئے کہ یہ جمہوری دور ہے اور جلد وہ دور آنے والا ہے کہ جب سر شماری پر رہنہیں ہے۔ بلکہ تعداد پر فیصلہ ہوگا۔ اس وقت حکومت اکثریت کے پاس چلی جائے گی۔ خود علامہ اقبالؒ نے جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو کہا کہ جب وہ حضور نظام سے ملے تو کہا جناب والا آپ اپنی طاقت سے واقف نہیں ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے حضور نظام سے کہا کہ یہاں اسلام کی تبلیغ بڑے پیمانے پر ہونی چاہیئے۔ اور اسلام کی تبلیغ اور اور اسلامی تہذیب کو فروغ ہونا چاہیئے۔ علامہ اقبالؒ نے نواب بہادر یار جنگ کو بھی مشورہ دیا تھا کہ یہاں اسلامی ثقافت، اسلامی تہذیب، اور اسلامی کلچر پھیلانا چاہیئے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا کہ آپ اپنی طاقت سے واقف نہیں ہیں۔ کہا میری طاقت؟ میری طاقت ایک ہاتھی کی ہے؟ آپ کی طاقت آپ کی دولت ہے آپ

ایک انٹرنیشنل بینک قائم کریں۔ جس سے سلطنیں اور قومیں بھی قرضہ لینے پر مجبور ہوں اور آپ انگریزی میں۔۔۔ بڑے پیمانے پر ایک اخبار نکالیں۔ تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میرا منصوبہ کیا ہے اور میں کیا کرنے والا ہوں۔ میں نے حیدرآباد کی مناسبت سے یہ واقعہ سنایا۔

نسل کا خلا

یہ ایک حقیقت ہے اور اس حقیقت کو ہندوستان کی سطح پر بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ یہاں کی اکثریت غیر مسلم ہے۔ اور یہ کہ غیر مسلم اکثریت خالی غیر مسلم نہیں بلکہ سیاسی تحریکوں نے ہم نے آپ نے آٹھ سو برس اس ملک پر حکومت کی ہے۔ اس کے اثرات بھی باقی ہیں۔ یعنی یہ ایسی غیر مسلم اکثریت نہیں ہے جس کا واسطہ پڑ رہا ہو۔ بلکہ یہ وہ اکثریت ہے جس سے واسطہ صدیوں تک رہا ہے۔ جو تاریخ لکھی گئی اور جو کورس میں پڑھائی جاتی ہیں اس میں بہت سی غلط فہمیاں، غلط بیانیاں اور رنگ آمیزیاں ہیں۔ جو مسلمانوں سے نفرت پیدا کرتی ہیں یہ بات وہ نہیں بھولتے اور یہ داغ انکے دل سے نہیں جاتا کہ کھلی اکثریت ہونے کے باوجود ایک چھوٹی سی اقلیت نے ان پر حکومت کی ہے۔ یہاں ہم کو مومنانہ کوشش کی اور حقیقت پسندی کی ضرورت تھی کہ ہمیں شروع سے یہ کوشش کرنی چاہیئے تھی کہ ہم علاقائی زبانوں اور خاص طور سے ہندی زبان کو اسلامیات سے بھر دیتے فارسی زبان کوئی قرآنی اور اسلامی زبان نہیں ہے۔ فارسی زبان بالکل ویسی ہے جیسے آج ہمارے لئے ہندی۔ جس مسلمانوں نے ایران فتح کیا تو ایرانی زبان اس وقت خالص غیر اسلامی زبان تھی آج تک اس نے دینی اصطلاحات قبول نہیں کی ہیں۔ خدا کا لفظ آتا ہے اللہ کا لفظ بھول جاتے ہیں۔ صوم کے بجائے روزہ ہوتا ہے۔ اور صلوٰۃ کے بجائے نماز۔ اور کئی الفاظ ایسے ہیں جن کا پس منظر جن کی بنیاد دینا مجوسیت سے کہیں نہ کہیں جا کر ملتی ہے۔ ماہرین زبان کا کام ہے کہ وہ تجزیہ کریں۔ ہمکو یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ کسی معجزہ کے بغیر یہ بات قابلِ تسلیم اور قابلِ قیاس نہیں ہے کہ اس ملک کی کایا پلٹ ہو جائے گی۔ اور کوئی ایسی بات ہو جائے کہ اکثریت اقلیت

میں تبدیل ہو جائے گی اور سب مسلمان ہو جائیں گے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ اس ملک کی اکثریت عرصۂ دراز تک۔ (اس کی حد اللہ کو معلوم ہے) غیر مسلم رہے گی اور ان کو اپنی زبانوں سے پوری وابستگی ہوگی۔ ان کو اپنی زبانوں سے وابستگی پر فخر ہے۔ اور وہ اپنی زبان کو ہر زبان پر ترجیح دیں گے۔ میں یہ عرض کر دوں کہ یہ بات قابلِ اعتراف اور قابلِ ندامت بھی ہے کہ آج اردو خطرے میں پڑ گئی ہے ہماری نئی نسل کا گیپ (gap) شروع ہو گیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے ۶۰۔۷۰ فیصد طلبا ایسے ہیں جو اردو سے ناآشنا ہیں۔ شعبۂ دینیات کے طلبہ نے درخواست دی تھی کہ انھیں ہندی میں جواب لکھنے کی اجازت دی جائے۔

خود میں اپنے گھر کا حال بیان کرتا ہوں کہ میرے پاس حجاز سے ایک خط آیا، کھولا اس میں ایک خط ہندی میں تھا۔ میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ہندی کے سوا کچھ جانتا ہی نہیں۔ ایک دو اور مثالیں بھی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نسل کا گیپ (gap) شروع ہو گیا ہے۔ یہ محاذ بہت ضروری محاذ ہے، اس پر پوری جنگ لڑنے کی ضرورت ہے۔ میں مستقل تلقین کرتا ہوں اور یہ میری دعوت کا ایک جزء ہے کہ اردو کو ہر قیمت پر قائم رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی علاقائی زبانوں اور ہندی میں بھی اسلامیات کا اتنا لٹریچر تیار کر دینا چاہیئے کہ جو لوگ اس زبان کے سوا کچھ نہیں سمجھتے وہ بھی پورے مسلمان ہو جائیں۔ اسلام کسی زبان کا پرستار نہیں ہے اس کو اپنے مقاصد اور عقائد عزیز ہیں اگر کوئی شخص اپنی علاقائی زبان سے بقدر اس کے کہ وہ نماز عربی میں پڑھ سکتا ہے اسے اتنا قرآن مجید یاد ہے اور جو چیزیں ضروری ہیں وہ یاد ہیں سیرت رسولؐ سیرت صحابہؓ سے واقف ہو۔ حلال و حرام کی تمیز اس کے اندر ہو، کفر و شرک کا فرق جانتا ہو تو نجات کے لئے کافی ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص اردو کا فاضل و محقق ہو لیکن نماز نہ پڑھتا ہو، دینیات سے اس کو سروکار نہ ہو تو یہ اس کے لئے خطرہ ہے اللہ تعالیٰ کے امتحان کا جو پرچہ ہے وہ آؤٹ ہو چکا ہے سب جانتے ہیں کہ اس میں کیا ہوگا "من ربک وما دینک وما تقول فی ھذا الرجل"۔ جو سب سے زیادہ نازک پرچہ تھا وہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے۔ سب سے زیادہ نازک پرچہ جس سے سب

سے پہلے واسطہ پڑنے والا ہے وہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے ہاتھ میں پہنچے ہوئے سے زیادہ یقینی طور پر دیدیا ہے کہ قبر میں یہ سوالات ہوں گے۔ اس کے لئے تو تکلم کی ضرورت ہوگی نہ کسی ترجمان کی وہاں کی دنیا اور ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمیں علاقائی زبانوں میں اسلامیات کے لٹریچر کو جلد منتقل کرنا ہوگا۔ اور خصوصاً ان تمام نفسیاتی، لسانی، اور اصولی تعلیم کے تمام ان تجربات اور ہدایات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ جو کسی زبان میں کسی لٹریچر کو منتقل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ میرے خیال میں ملیالم میں سب سے زیادہ کام ہوا ہے۔ لیکن بنگالی اور مراٹھی میں بہت کم کام ہوا ہے میری، مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی بہت سی کتابیں ریاستی زبانوں میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ضرورت متقاضی ہے کہ ادب اسلامی کے حصہ کو نمایاں کیا جائے اور قدیم ادب میں سے کر کے وہ چیزیں نکالی جائیں اور جدید ادب میں کتب خانہ پیدا کیا جائے۔ ہمیں اپنی غیر مسلم اکثریت کی طرف جلد توجہ دینی چاہیئے۔ ایک بات یہ بھی کہدوں کہ جنوب میں اشاعت اسلام کے واقعات ہوئے لیکن محتاط طریقے سے اشاعت ہوئی۔ واقفیت سے کچھ بڑھ کر اس کا پروپیگنڈہ ہوا ہے۔ اس وقت ہندو فرقہ پرست تنظیموں نے جنوب کو اپنا میدان اور مطمح نظر بنا لیا ہے۔ ان کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جنوب میں تعصب کم ہے، انہوں نے اس بات کو سمجھ لیا ہے کہ جنوب میں خطرہ زیادہ ہے اپنی زبان میں ہم کہیں کہ جنوب میں تعصب کم ہے وہ اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ جنوب میں خطرہ زیادہ ہے۔

یہاں اب وہ صورت نہیں ہے جو آج سے دس برس پہلے تھی۔ میناکشی پورم کی وجہ سے مبالغہ آمیز طریقے سے جو اعداد و شمار دیئے گئے ہیں انکے نتیجے میں ادھر بہت نگاہیں ہیں جیسے تامل ناڈو اور کیرالا کے ساتھ ساتھ آپ کا تلنگانہ بھی آتا ہے۔

طاقت اور وسعت کیساتھ کوشش

آج جس انداز میں تبلیغ و اشاعت دین کا جو کام ہو رہا ہے اس سے دس گنا زیادہ طاقت اور حجم کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ ایسی کوشش ہونی چاہیئے کہ کوئی گاؤں، کوئی قصبہ خالی نہ ہو، ہر ضروری چیز اس زبان میں منتقل ہو جائے اس میں کشش اور عمومیت پیدا ہونے کیلئے جتنی چیزیں ماہر نفسیات و ماہر لسانیات ضروری

سمجھتے ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیئے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہماری جو طاقت، دولت اور ذہانت صرف ہو رہی ہے، اگر اس کا دسواں حصہ بھی صرف ہوا ہوتا تو آج صورت حال دوسری ہوتی۔ مجھے خوشی ہے کہ اس طرف یہاں توجہ بڑھ رہی ہے، مگر اس کی رفتار اور وسعت کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ رہا یہ سوال کہ ہم اس کے لئے کیا طریقے اختیار کریں۔ تو میں کہوں گا کہ ہم اپنی اسلامی سیرت کا مظاہرہ کریں۔ اپنے اخلاق و کردار سے دلوں کو فتح کریں۔ انڈونیشیا ملیشیا وغیرہ سب عرب تاجروں اور صوفیائے کرام کے اخلاق سے مسخر ہوئے ہیں۔ خود آپ ہندوستان میں دیکھ لیجئے۔ اگر ان کے ساتھ ہمدردی اور انسانیت کا معاملہ ہو تو وہ اسلام کی طرف کھنچیں گے۔ ان چیزوں کو بڑھائیں جو ان کو اسلام سے قریب کر دیں۔ تلگو میں اسلامی لٹریچر کو منتقل کرنے کیلئے ادارے قائم کیجئے، اور مصنفین و مترجمین کی ہمت افزائی کیجئے اور اس میں کسی جماعت کو سامنے نہ رکھیئے۔ بلکہ دین کو سامنے رکھیئے، اور نہ یہ سوچیئے کہ فلاں جماعت کام کرے تو اس کا حلقہ وسیع ہوگا۔ اس کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ ہوگی۔ تو اس میں اللہ تعالیٰ کی وہ مدد نہیں ہے جو خالص اشاعت اسلام کے لئے ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاتح خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا:۔ علیؓ! تمہارے ہاتھ سے اگر ایک آدمی کو ہدایت ہو جائے تو تمہارے لئے بڑی سے بڑی دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔

(بشکریہ ماہنامہ رہگذر حیدرآباد)

بقیہ ص ۹

کسی شہر کا نام ہے"۔

دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر آر۔ ایل شکلا نے بھی انکشاف کیا ہے کہ موجودہ اجودھیا شری رام چندرجی کی اجودھیا نہیں ہے۔ تقریباً ۲۵ سال قبل ایک تحقیقی کھدائی کے نتیجے میں یہ انکشاف ہو چکا ہے کہ اس علاقہ کی آبادی ۷۰۰ سال قبل مسیح سے زیادہ پرانی نہیں ہے۔ یہ تحقیق پروفیسر بی بی لال اور کے این دکشت نے ۱۹۷۹-۸۰ء میں کی تھی۔ یہاں کھدائی میں ایسے بڑے محلوں کے کوئی نشانات نہیں ملے جیسے بڑے محلوں کا رامائن میں ذکر کیا گیا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ موجودہ اجودھیا ہی شری رام چندرجی کی اجودھیا ہے تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ شری رام چندرجی کا زمانہ گوتم بدھ کے زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح سے زیادہ قدیم نہ تھا اور یہ تاریخی حیثیت میں غلط ہوگا۔ بہرصورت اس بات کی ضرورت اب بھی ہے کہ اس معاملے میں اس علم کے سربرآوردہ عالم مزید تحقیق کر کے صحیح صورت حال سامنے لائیں۔

اس پورے ڈرامے میں مقامی انتظامیہ نے جو کردار انجام دیا ہے وہ بہت زیادہ قابلِ اعتراض ہے۔ اس نے ہماری ریاست میں فرقہ وارانہ اور فسطائی رجحانات کی ہمت افزائی کی ہے۔ اعلیٰ سرکاری افسروں کی جانب سے فرقہ پرستوں کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اور ہمت افزائی کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ یوپی میں پولیس کے سابق ڈائرکٹر جنرل ایس سی دکشت ریٹائر ہونے کے فوراً بعد لکھنؤ میں جنم بھومی یاترا تقریبات کی استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین بنا دیئے گئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی سیکولرازم کو ان لوگوں سے زیادہ خطرہ ہے جن کو اس کی حفاظت کے لئے تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ یوپی کے ایک سابق وزیر شری داؤ دیال کھنہ نے اشتعال انگیز غلط بیانیوں پر مشتمل ایک زہریلا پمفلٹ لکھا ہے جس کو تاریخ کے عام خرافات سے زیادہ کوئی درجہ نہیں دے سکتے۔

اس معاملے میں عدالتوں میں جو قانونی لڑائی لڑی گئی وہ التوا، تاخیر اور ہراساں کرنے کے رویہ کی ایک روشن مثال ہے۔ اس کے باوجود کہ مسجد مقفل تھی ہندوؤں کو اس کے احاطہ میں واقع چبوترا پر جانے کی اجازت تھی۔ ۱۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ایک شخص شری گوپال سنگھ وشارد نے یہ دعویٰ دائر کیا تھا کہ ہندوؤں کو مسجد (جس کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ وہ جنم استھان مندر ہے) میں ہندوؤں کو داخل ہونے اور پوجا پاٹھ کرنے کی اجازت دی جائے۔ بہرحال جب یہ مقدمہ اختتام کے قریب پہونچا تو تاخیر پیدا کرنے والا رویہ اختیار کیا جاتا اور ہماری عدلیہ اس جال میں پھنس جاتی تھی۔ اور پھر ۱۹۶۱ء میں

اس معاملے کے تمام مقدمات کو ایک میں ملا کر ایک مقدمہ نمبر ۱۲ سنہ ۱۹۶۱ء کی شکل دیدی گئی۔

جنوری ۱۹۸۶ء کے آخری ہفتہ میں جو کچھ ہوا وہ سامنے ہے۔ ۲۵ر جنوری ۱۹۸۶ء کو ایک شخص شری پانڈے نے منصف صدر فیض آباد کی عدالت میں ایک درخواست دی کہ پوجا کے لئے مسجد کا تالا کھول دیا جائے۔ ۲۸ر جنوری ۱۹۸۶ء کو منصف نے درخواست پر فیصلے کی تاریخ مقرر کر دی۔ پانڈے نے ۳۰ر جنوری ۱۹۸۶ء کو ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں اپیل دائر کر دی۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کو بھی طلب کیا جاتا کہ وہ اپنا نقطہ نگاہ پیش کرتے کیونکہ جو اصل مقدمہ زیر سماعت تھا اس میں مسلمان بھی فریق ہیں۔ لیکن یہاں تک ہوا کہ جب مسلمانوں نے کوشش کی کہ ان کے وکیل کے ذریعے ان کی بات بھی سنی جائے تو ان کی درخواست مسترد کر دی گئی اور یکم فروری ۱۹۸۶ء کو عدالت نے پوجا کے لئے مسجد کا تالا کھول دینے کا حکم دے دیا۔

سیول جج کی عدالت میں اصل مقدمہ کے زیر سماعت ہونے کے باوجود جس انداز میں ڈسٹرکٹ جج فیض آباد نے صرف ایک پارٹی کے لئے تالا کھولنے کا حکم دیا اور دوسری پارٹی کو سننے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی اس سے عدلیہ کے نظام پر لوگوں کا اعتماد متزلزل ہو گیا۔ بہرصورت اس وجہ سے سیکولر اور جمہوری طاقتوں کو ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔ سیکولرازم کے مقاصد کے لئے ایک سچے مجاہد کی حیثیت میں اپنی لڑائی اعلیٰ عدالتوں میں اور رائے عامہ کی عدالت میں جاری رکھنی چاہیئے۔

ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو صحیح حالات سے واقف کرائے اور ان تک صحیح اطلاعات پہونچائے۔ لیکن اس نازک موقع پر ذرائع ابلاغ نے کوئی شاندار کارنامہ انجام نہیں دیا۔ صحیح حقیقت پیش کرنے کے بجائے رپورٹیں مبالغہ آمیز اور جانب دارانہ تھیں۔ مثال کے طور پر تقریباً سبھی ٹی وی اخباروں نے یہ لکھا کہ رام جنم استھان کا تالا کھول دیا گیا ہے اور اس کو پوجا کے لئے کھول دیا گیا جبکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ ایک مسجد کو جو کہ ۴۰۰ سال سے زیادہ مدت سے مسجد تسلیم کی جاتی رہی ہے اس کو مندر بنا دیا گیا ہے۔ یہ صرف ایک ایسا معاملہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنی عبادت گاہ کی بحالی کے لئے آئینی اور قانونی لڑائی لڑ رہے ہیں بلکہ یہ ایک ایسی لڑائی بھی ہے جو سیکولرازم، جمہوریت اور گاندھی جی کے نظریہ رام راج کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ رام راج کے دشمنوں نے خود رام کے نام پر اس نظریہ پر ضرب لگائی ہے۔

(بشکریہ ہفت روزہ نئی دنیا ۱۸ تا ۲۴ مارچ ۱۹۸۶ء)

مجلسِ دعوۃ الحق کی قابلِ مطالعہ پیشکش

کلامِ صوفی حضرت صوفی سید عبدالرب صاحبؒ کی شخصیت علمی دینی اور ادبی حلقہ میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ موصوف سلسلۂ تھانوی سے منسلک ایک مثالی مردِ مومن، اسلام کے وفادار مجاہد اور لایخافون فی اللہ لومۃ لائم کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ واہب حقیقی نے آپ کو کمال شاعری اور ذوق سخن سے بھی بھرپور نوازا تھا۔ حضرت صوفی صاحبؒ نے کلام کی ہر صنفِ محمود پر طبع آزمائی فرمائی ہے مگر حرارتِ ایمانی، جذبۂ اصلاح اور للہیت آپکے کلام کی وہ روح ہے جو ہر پڑھنے اور سننے والے کے قلب کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی صوفی صاحب کا یہ ایمانی اور ادبی ذخیرہ یوں تو سینکڑوں صفحات میں پھیلا ہوا ہے مگر اس کا ایک انتخاب "کلام صوفی" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانی دامت برکاتہم اور حضرت شاہ محمد ابراہیم صاحب ایم اے مدظلہم العالی کے قیمتی اور معلومات افزا مقدمات نے کتاب کی افادیت کو دوچند کر دیا ہے۔ ۲۰×۲۶/۱۶ سائز کے پانچ سو سے زائد صفحات۔ کتابت، طباعت، کاغذ، جلد ہر چیز معیاری۔۔۔ قیمت چالیس روپے -/45

اہم سفر اس کتاب میں قرآن و حدیث اور بزرگوں کے کلام سے ایسے موثر مضامین اور عبرت آموز حکایات و اشعار جمع کر دیئے گئے ہیں جن سے سفر آخرت کی تیاری کی فکر پیدا ہو۔ ساتھ ہی بیماری کے مسائل، تلقین کلمہ، غسل میت، کفن دفن، نماز جنازہ اور ایصال ثواب کا مسنون طریقہ نیز وصیت و میراث کے اہم مسائل بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جنکی طرف عوام بلکہ خواص کو بھی کم ہی توجہ ہوتی ہے خوبصورت ٹائیٹل کے ساتھ۔ قیمت پانچ روپے -/5

تحریکِ ایمان دینی دعوت اور تبلیغی جدوجہد کے بارے میں حضرت صوفی سید عبدالرب صاحبؒ نے ایک غیر معمولی طویل ترین نظم کہی تھی جسمیں دنیا کے عام شر و فساد اور خاص کر مسلمانوں کی دینی بربادی پر خون کے آنسو بہائے ہیں اور امت کے اہل درد کو توجہ دلائی ہے کہ بے طلب عوام مسلمین کی خبرگیری اور اللہ و رسول اور دین سے ان کا تعلق جوڑنے کیلئے تبلیغی جماعتوں کے طرز پر عمومی دینی دعوت اور اصلاحی جد و جہد کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صوفی صاحب نے یہ سارے مضامین بڑے موثر اور پر درد انداز میں ادا کئے ہیں ساتھ ہی ساتھ تبلیغی کام کے اصول آداب اور اس پر خداوندی نصرت کے وعدوں کا بیان اور اس سلسلہ کے دوسرے مضامین ہیں۔ کتاب کے شروع میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی دامت برکاتہم کا مفصل و مبسوط پیش لفظ بھی ہے۔ خوبصورت ٹائیٹل کے ساتھ۔ قیمت تین روپے -/3

زبانی نصاب یعنی ماثورہ دعائیں اور اسلامی آداب اس کتاب میں روزمرہ کی مسنون دعائیں، کلمے اور نماز پنجگانہ، نماز جنازہ وغیرہ کی دعائیں ترجمہ کے ساتھ نیز کھانے پینے، سونے جاگنے، کپڑا پہننے، مجلس میں بیٹھنے، بڑوں سے ملنے مسجد میں جانے سلام و مصافحہ، چھینک، جمائی، استنجاء وغیرہ کے اسلامی آداب نیز پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کا مختصر آئینہ اور آپ کے خاص گھر والوں کے نام وغیرہ نہایت ضروری باتیں جمع کر دی گئی ہیں، ساتھ ہی ایمانی جذبہ کو ابھارنے والی نظمیں بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ الغرض یہ کتاب ہر مسلمان گھر کیلئے ضروری چیز اور ایمانی تحفہ ہے۔ مکاتیب اسلامیہ کے نصاب میں داخل کرنے کے لائق کتاب۔ دیدہ زیب ٹائیٹل کے ساتھ۔ قیمت پانچ روپے

تذکرہ حضرت مصلح الامتؒ مجلد حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ کی سوانح حیات قیمت تیس روپے -/30

نقشۂ دینی نصاب اگر بچوں کو ابتدائی قاعدہ ہی سے مدرسین کرام حروف کے مخارج اور میم و نون کے اخفاء، اظہار، غنہ اور لام و راء کے پر باریک پڑھنے کے قواعد کا خیال رکھتے ہوئے پڑھائیں تو بچے ابتدا ہی سے قاری ہو جائیں۔ چنانچہ اس سلسلہ کے ضروری قواعد آسان عبارت میں اختصار کے ساتھ اس نقشہ میں لکھ دیئے گئے ہیں، نیز سرکاری اسکولوں میں جانے والے بچوں کیلئے کم وقت میں پڑھایا جانیوالا دینی نصاب اور تعلیم و تربیت کے بارے میں کچھ مفید ہدایات بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ الغرض یہ نقشہ مکاتب اسلامیہ کے مدرسین کرام کی خدمت میں ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ -/1

آسان روزی اور رد بلا روزی میں آسانی و برکت اور دشمنوں و بلاؤں و مصیبتوں سے حفاظت کیلئے محترم صوفی عبدالرحمٰن صاحب دامت برکاتہم (خلیفہ مجاز حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ) نے چھوٹے چھوٹے چند رسائل تالیف فرمائے ہیں جن میں قرآن و حدیث اور بزرگانِ دین کے اقوال سے اس سلسلہ کی دعاؤں اور معمولات کو جمع فرما دیا ہے۔ ۱۔ آسان رزق اردو قیمت 50 پیسے ۲۔ آسان رزق گجراتی قیمت 50 پیسے، آسمانی زمینی قیمت -/2 ، ۴۔ راہ امن ایک روپیہ -/1

گجراتی دینی نصاب دینی مضامین کے ساتھ گجراتی زبان سکھانے والی کتابیں مجلس ہذا کی طرف سے بڑے اہتمام سے شائع کی گئی ہیں، جو گجراتی مسلمانوں کیلئے شرک و کفر کے مضامین سے بھرے ہوئے اسکولی کورس کا نعم البدل ہے۔ اس سلسلہ کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ گجراتی تختی، قیمت۔ ایک روپیہ ۲۔ ایمان بال پوتھی۔ قیمت تین روپے -/3

۳۔ اسلامی پہلی چوپڑی۔ قیمت پانچ روپے -/5 ۴۔ اقرأ واچن مالا۔ قیمت -/5

نوٹ: تاجر حضرات کیلئے ادارہ کی تمام کتابوں پر خصوصی رعایت دی جائیگی

ملنے کے پتے: **محمد یونس صدیقی خادم مدرسہ دعوۃ الحق کڈی۔ اتر گجرات**

الفرقان بکڈپو۔ ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی:

نئے بل میں مطلقہ عورتوں کے حقوق کا زیادہ تحفظ

خلافت تحریک کے بعد اتحاد کا نیا تجربہ

انگریزی اور ہندی اخباروں کی روش پر تشویش

شریعت اسلامی سیمینار میں تجاویز، دار القضا کے قیام پر زور دیا گیا

لکھنؤ ۱۳ مارچ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی نے ۱۹۱۹ء میں اس وقت کی یاد تازہ کرتے ہوئے جب امرتسر میں خلافت کانفرنس میں مہاتما گاندھی نے شرکت کی تھی اور ہندو مسلم اتحاد کا ایک بے مثل منظر دیکھنے میں آیا تھا پارلیمنٹ میں بورڈ کی کوششوں کے نتیجے میں مطلقہ عورتوں کے تحفظ سے متعلق بل پیش کئے جانے پر انگریزی اور ہندی کے اخبارات کے رویے پر تشویش ظاہر کرتے ہوئے اس حیرت کا اظہار کیا کہ اگر مسئلہ خلافت میں گاندھی جی اور نہرو کے ساتھ ساری کانگریس نے مسلمانوں کی حمایت کی تھی جبکہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا براہ راست کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا تو ایک ایسے مسئلے میں جسے مسلمان خالص مذہبی سمجھ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسکے طے ہونے سے یہاں زندگی عافیت میں گزرے گی تو یہ کہاں کی سمجھداری ہے کہ سارا ہندوستان مسلمانوں کے خلاف ہو جائے۔

مولانا علی میاں نے جو ندوۃ العلماء کے نسواں اسکول میں ہندوستان میں شریعت اسلامیہ کے موضوع پر صوبہ ایکشن کمیٹی پرسنل لا بورڈ اور انجمن شباب اسلام کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ کل ہند سیمینار سے خطاب کر رہے تھے وضاحت کی کہ جو بل پیش ہوا ہے وہ مطلقہ عورت کے حقوق کا اس سے زیادہ تحفظ کرتا ہے جتنا سپریم کورٹ کے فیصلے سے تھا اور کوئی بھی فرسٹ کلاس مجسٹریٹ ایک ماہ میں اسے نفقہ دلا سکتا ہے۔

انہوں نے ان اخباروں کے رویے پر حیرت ظاہر کی جس سے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے خدانخواستہ ملک پر حملہ ہو گیا ہو اور اسکی سلامتی کو خطرہ پیش ہو اور کہا کہ بالکل وہ کیفیت پیدا کی جا رہی ہے جو حالات جنگ میں کسی قوم کو ہوتی ہے جب اسکا ذہنی توازن قائم نہیں رہتا۔ برادران وطن نے احساس تناسب کھو دیا ہے انہوں نے کہا کہ طلاق کے واقعات تو ہوتے ہی رہتے ہیں کیا یہ معاملہ مسلم معاشرے کے لئے کبھی بڑا مسئلہ بنا لیکن اسے پیش یوں کیا جا رہا ہے کہ جیسے ساری دنیا کی عورتوں پر یہ قانون نافذ کیا جا رہا ہو اور جیسے ساری دنیا کی تاریخ میں انسانیت کے خلاف اس سے بڑا کوئی واقعہ نہیں ہوا مولانا نے کہا کہ یہ کون سا کرائسس ہے جس کے لئے انگریزی اور ہندی کے اخبار اپنے قیمتی کالم لگائے ہوئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اب کوئی دوسرا مسئلہ ہی نہیں ہے لیکن فسادات میں کتنی ہی عورتیں بے سہارا بیوہ اور لاوارث ہو گئیں، مگر ان کے لئے ہمدردی کا کیا کبھی ایک لفظ بھی شائع ہوا۔

مولانا علی میاں نے محسوس کیا کہ خطرہ یہ نظر آنے لگا ہے کہ مسلمان اتحاد کا مظاہرہ کر کے حکومت پر اثر ڈال سکتے ہیں اور عدالتی فیصلے کو بدلوا سکتے ہیں اور یہ کہ ان کے نمائندے اپنی افہام و تفہیم کی صلاحیت اور مطمئن کرنے کی صلاحیت سے نوخیز وزیر اعظم کو متاثر کر سکتے ہیں۔

مولانا نے سیمینار میں شریک ہونے والوں کی توجہ خاص طور سے اس بات کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا کہ آپ کی اصلی طاقت ایمانی جذبہ اور اتحاد ہے اور خلافت کی تحریک کے بعد کا یہ ایک نیا تجربہ ہوا ہے کہ ایک آواز ہو کر یہ گونج پیدا کر دی کہ سپریم کورٹ کا فیصلہ شریعت کے خلاف ہے اور ہم اسے قبول نہیں کر سکتے۔

مولانا علی میاں نے کہا کہ تحریک خلافت کے بعد آج جس مسئلے نے ہمیں اتنے بڑے پیمانے پر متحد کیا اور جو سارے ملک کا موضوع سخن بنا ہوا ہے وہ نفقہ مطلقہ کا مسئلہ ہے جس کے بارے میں سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ مطلقہ عورت کے نان و نفقہ کی ذمہ داری سابق شوہر کی ہے۔

مولانا علی میاں نے اس موقع پر ہندوستان کے مختلف فرقوں اور ہندو دھرم کے نمائندوں سمیت دنیا کے تمام دانشوروں، اہل مذہب اور اہل علم کو متوجہ کرتے ہوئے یہ طے کرنے کی ضرورت پر زور دیا کہ مذہبی احکام کی تشریح کرنے کا اختیار اس کے اپنے ماہرین کو ہے یا کوئی بھی جو دوسرے فن یا قانون کا ماہر ہو وہ کر سکتا ہے انہوں نے کہا کہ یہ مسئلہ خالص اصولی، انسانی، اخلاقی اور بین اقوامی نوعیت کا ہے اور اس حیثیت کا ہے کہ اگر اقوام متحدہ کے دائرہ کار میں اس قسم کے معاملات شامل کر دئیے جائیں تو وہاں اٹھایا جا سکتا ہے انہوں نے کہا کہ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ اس استحقاق کے بارے میں ہم کو قایل کیا جائے۔ یہ ایک قومی چیلنج ہے جسے سرسری طور پر چھوڑا نہیں جا سکتا، اس چیلنج کے بعد مسلمان اپنے کو محفوظ نہیں سمجھتے کیونکہ آج اس قانون میں مداخلت ہوئی ہے کل دوسرے میں ہوگی اور یہ بات اعلیٰ سطح پر مانی گئی ہے۔

ترقی میں رکاوٹ

مولانا نے اسے ملک کی ترقی میں رکاوٹ قرار دیتے ہوئے کہا کہ اتنے بڑے فرقے کی صلاحیت اور ذہانت کو ملک کی ترقی کے کام میں صرف ہونے دینے کے بجائے دوسرے معاملات میں الجھایا جا رہا ہے انہوں نے کہا کہ اس کا کیا جواز ہے کہ اتنے بڑے فرقے کو ایک ضمنی مسئلے میں بے چین کر دیا جائے اور اس کا وقت ضائع کیا جائے اور دوسروں کا وقت اس بات کے سننے میں ضائع کرایا جائے۔

مولانا علی میاں نے کہا کہ یہ زلزلہ انگیز اور انقلاب انگیز مسئلہ دور رس نتائج کا حامل ہے، انہوں نے اس مسئلے کی آفاقی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگر ہندو دھرم کے لوگوں کو احساس ہو جائے کہ اس بات کا کیا اثر پڑے گا تو مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہو جائیں گے کیونکہ آج ہم کل تمہاری باری، والا معاملہ ہے کل ہمارے مذہب کے ساتھ ایسا ہو اور آئندہ سپریم کورٹ کا کوئی مسلمان جج سرسری طور پر اردو کتابیں دیکھ کر کسی کے مذہبی معاملے میں فیصلہ دیدے، اسی طرح عیسائی یا سکھ جج کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ مولانا نے کہا کہ وہ تو اپنے مطالعہ کی روشنی میں انسانیت کے نقطہ نظر سے نہایت صحیح جذبہ کے ساتھ فیصلہ دینگے لیکن اصول کی بات یہ ہے کہ محض دینی قابلیت سے فیصلہ دینا ایک خطرناک بات ہے تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ معاشروں اور قوموں کا زوال اجتماعی طاقت کی کمی سے نہیں ہوا بلکہ اس لئے ہوا کہ حقائق سے چشم پوشی اور عملی زندگی سے انکار ہوا۔

اسلامی ملکوں میں شرعی قوانین میں تبدیلیوں کے بارے میں جو حوالے دئیے جاتے ہیں اور جس کے بارے میں خود وزیر اعظم نے پرسنل لا بورڈ کے صدر اور ممبران سے کہا تھا کہ ان ملکوں سے بھی صلاح و مشورہ کر لیا جائے اس کے متعلق مولانا علی میاں نے کہا کہ عرب ملکوں سے مجھ سے زیادہ کوئی واقف نہ ہوگا چنانچہ انہوں نے پورے وثوق اور دعوے سے کہا کہ تونس اور لیبیا کو چھوڑ کر جہاں کے حالات مختلف ہیں کسی بھی اسلامی ملک میں غیر ذمہ دارانہ طور پر کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

انہوں نے وزیر اعظم سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ان سے کہا کہ مجھ سے زیادہ آپ کو یہ حق ہے کہ اس پوزیشن کو قبول نہ کریں کہ اسلامی ملکوں سے مشورہ کرنا چاہئے بلکہ آپ کو ڈٹ کر کہنا چاہئے کہ ہمارے یہاں ایسے اسکالر موجود ہیں کہ جنکی اسلامی ملکوں میں قدر کی جاتی ہے انہوں نے کہا کہ مجھے خود اپنی مثال پیش کرنا پڑی اور میں نے ایک ایسی مثال پیش کی کہ جب ایک مسئلے پر دنیا بھر کے ممتاز علما نے میری بات مانی ہے۔ مولانا نے وزیر اعظم سے کہا کہ آپ کے خاندان کی تیسری پشت ملک کی قیادت کر رہی ہے اور آپ کو جاننا چاہئے کہ آپ کا ملک جہاں اور چیزوں میں خود کفیل ہو رہا ہے وہاں علمی طور پر بھی اور خصوصاً اسلامی معاملے میں خود کفیل ہے۔

مولانا نے وزیر اعظم سے یہ بھی کہا کہ ہم نے اپنا دینی موقف شریعت اسلامی قرآن و سنت سے وابستہ کیا ہے، عربوں سے نہیں انہوں نے یہ بات بھی صاف کر دی کہ عرب ملک کوئی قدم اٹھائیں تو ہم اس کے پابند نہیں۔ ہم قرآن کے پابند ہیں اور جہاں تک شرعی قوانین اور عائلی قوانین کا تعلق ہے۔ عرب ملکوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی

اہل خیر حضرات کی حوصلہ مندانہ اعانت کی طالب ہے

۲۶ محرم الحرام ۱۴۰۶ھ ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۵ء کو ندوۃ العلماء کے جلسہ انتظامی کے موقع پر ناظم صاحب ندوۃ العلماء نے اپنی رپورٹ میں جہاں موجودہ خطرات و اندیشوں کا تذکرہ فرمایا وہیں ان کے مقابلہ و پیش بندی کی طرف اراکین انتظامیہ اور ملت اسلامیہ ہندیہ کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

ایک قابل ذکر اور قابل شکر اقدام شعبہ تحفیظ القرآن والتجوید کی نئی عمارت کے سلسلہ کا آغاز ہے، برادر محترم ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کے عہد نظامت میں دار العلوم میں حفظ قرآن و تجوید کی مشق کا اہتمام شروع کیا گیا اور اس میں یوماً فیوماً ترقی ہوتی رہی، مسجد کی تعمیر کے بعد سے یہ شعبہ اسی میں کام کرتا رہا، اگرچہ مسجد میں ہونے کی وجہ سے اور اذان فجر سے پہلے حفظ و تلاوت کا منظر بڑا روح پرور اور بابرکت ہوتا ہے اور اس سے مسجد کی آبادی اور رونق میں بڑا اضافہ ہے لیکن طلبہ کی تعداد میں روز افزوں اضافہ کی وجہ سے کئی سال سے اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ اس کے لئے الگ عمارت تعمیر کی جائے اور وہیں ان طلبہ کی رہائش اور تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ دار العلوم میں واقع اقامت خانوں (ہوسٹلوں) کے ناکافی ہونے کی وجہ سے اور بھی شدت سے اس کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، اس شعبہ کی مستقل عمارت کا سنگ بنیاد اگرچہ کئی سال پہلے رکھا جا چکا تھا لیکن مالی دقتوں کی وجہ سے اس کی تعمیر کا کام نہیں شروع کیا گیا تھا۔ **اب بنام خدا** تعمیر کے سلسلہ کا آغاز کر دیا گیا، مصارف کا اندازہ تینتیس لاکھ سے زیادہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ جس طرح ابھی تک دار العلوم کے کاموں میں مدد فرماتا رہا ہے اس سے امید ہے کہ انشاء اللہ یہ عمارت بھی پایہ تکمیل کو پہونچے گی، اس عمارت میں ڈھائی سو طلبہ کے قیام کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس شعبہ کے سب متعلقات و ضروریات یہیں مہیا کی جائیں گی، قرآن مجید سے نسبت رکھنے کی بنا پر توقع کی جاتی ہے کہ اہل خیر و توفیق اس میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

جب ایک مستقل عمارت کے سلسلہ میں جو دار العلوم کے تعمیری، تعلیمی و انتظامی شعبوں میں ایک اہم اور عزیز اکائی کی حیثیت رکھتی ہے، ذکر آگیا ہے، تو اتنا اور عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ ندوۃ العلماء کے بیرونی بالخصوص عرب ممالک سے روابط کی بنا پر جو الحمد للہ زیادہ تر علمی، فکری اور دعوتی ہیں نیز اس کے ۱۹۷۵ء میں منعقد ہونے والے تاریخی جشن تعلیمی کی کامیابی اور شہرت کی بنا پر ملک میں عام طور پر یہ تاثر قائم ہو گیا ہے کہ ندوۃ العلماء کو پیسے کی کوئی کمی نہیں اور مالیات کے سلسلہ میں اس کے لئے تردد و فکر کی کوئی بات نہیں، اس کا اثر ملک کے چندے پر بھی پڑا ہے، لیکن جو لوگ ندوۃ العلماء کے معیار و مزاج، امکانی حد تک اصولوں کی پابندی اور اس کی احتیاطوں سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس سلسلہ میں حقیقت کم اور خوش گمانی زیادہ ہے،

اس لئے اس پہلو کی طرف بھی محترم ارکان کو توجہ منعطف کرنے کی ضرورت ہے، خاص طور پر جن حلقوں میں ہمارے سفراء جائیں ان کی اخلاقی مدد و ہمت افزائی اور کلمہ خیر کہنے کی ضرورت ہے،

(مولانا) سید ابو الحسن علی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء)

نوٹ:- چک ڈرافٹ، منی آرڈر مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں، مرسلہ رقم جس مد کی ہو اس کی صراحت ضروری ہے۔ چک یا ڈرافٹ پر صرف یہ لکھئے:
ناظم ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس ۹۳، ندوہ، لکھنؤ

بقیہ صـ ١٢

ہے۔ مولانا نے بتایا کہ ایک بار مصر میں مطلقہ عورت سے متعلق ایک قانون آیا تھا جسے جامعہ ازہر کے علماء نے مسترد کر دیا اور حکومت نے ان کی بات مان لی۔

مولانا نے کہا کہ اب یہاں پر یہ مسئلہ ہے کہ آپ شریعت کے مطابق زندگی گزاریں گے اور شریعت کا فیصلہ آپ کے علماء کریں گے۔

مولانا علی میاں نے امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے امیر مولانا مجاہد الاسلام کے جنہوں نے ان سے قبل تقریر کی تھی، اس مشورے کی تائید کی۔ کہ ملک کے مسلمانوں کو چاہئے کہ کسی کو مانیں "ساری طاقت اسی میں ہے۔ علماء کو سب سے پہلے ماننا ہوگا۔ اور اگر کسی شخص کو ماننے کا عہد کر لیا جائے تو شریعت پر کوئی آنچ نہیں آسکتی ہے۔

اہم تقاضے

مولانا مجاہد الاسلام... خصوصی طور پر سیمینار اور اس موقعہ پر ہونے والے عام جلسوں سے خطاب کرنے یہاں آئے تھے۔ اپنی نپی تلی ہوئی تقریر میں وقت کے ان اہم تقاضوں کو پورا کرنے کی ضروریات پر زور دیا کہ صفوں کو مضبوط کیا جائے اور انتشار نہ آنے دیا جائے انہوں نے اس بات پر اطمینان ظاہر کیا۔ کہ عام مسلمان شریعت کے خلاف جانے کو تیار نہیں ہیں۔ اور کہا کہ ہم کو اپنے اوپر شریعت کے فیصلے کو نافذ کرنا ہے اور اس کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جہاں ہم سرکار سے شریعت کے لئے جد و جہد کرتے ہیں ہمیں مضبوط قلعہ بندی سے غافل نہیں رہنا چاہئے

مولانا مجاہد الاسلام نے اس بات پر بھی زور دیا کہ جذبات تو ٹھیک ہیں لیکن عقل بھی ضروری ہے۔ بورڈ نے گالیوں کے نہ جانے کتنے تیر سہے۔ لیکن وقت نے بتایا کہ تدبیر اور بھرپور قیادت نے ہمارے قافلے کو کامیابی کی منزل تک پہنچایا۔ اگر جذباتی یا بزدل قوت ہوتی تو کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ سنجیدہ فکرمند اور جری قیادت کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اس جگہ پہنچے۔ لیکن یہ منزل پوری لڑائی کی سب سے نازک موڑ ہے۔ انہوں نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ہمارے اکابرین نے جو سوچا اسے وزیر اعظم نے نہ صرف سمجھا بلکہ اسکی وکالت بھی کی

مولانا مجاہد الاسلام نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اس فکری لڑائی میں مسلمانوں کا اصل مقابلہ غیر مسلموں سے نہیں ہے جو ہماری پبلسٹی کے وسائل کی کمی کی بنا پر غلط پبلسٹی کا شکار ہیں۔ اور حقائق سے صحیح طور پر واقف نہیں ہو پا رہے ہیں بلکہ ترقی پسندوں سے ہے۔ جو اپنے نام اور آباء و اجداد کے لحاظ سے اپنے کو مسلمان ثابت کرتے ہیں۔ انکی بات اتنی زوردار طریقے سے اور اتنے ذریعوں سے سامنے آرہی ہے کہ جھوٹ سچ بنتا جا رہا ہے۔

مولانا نے سمجھداری کے ساتھ ساتھ اس نازک وقت میں اتحاد پر خاص زور دیتے ہوئے کہا کہ ملک میں فرقہ وارانہ صورت حال کو خراب کرنے کی منظم کوشش ہو رہی ہے اور اس کی بو ہر شہر اور گاؤں میں سونگھی جا سکتی ہے۔ اس لئے دشمنوں کا آلہ کار بننے سے گریز کرنا چاہئے اور سخت الفاظ کا استعمال بھی کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے،

اس موقع پر سیمینار کے روح رواں مولانا سلمان الحسینی ندوی نے اپنے مقالے میں اسلام اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری اور شریعت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ ہندوستان میں جب ہندو اسٹیٹ تھی تو مسلمان اپنے قاضیوں اور مفتیوں سے ہدایت لیتے تھے۔ اور ہندو راجہ مسلمانوں کے فتوے کی روشنی میں فیصلہ دیتے تھے، یہی صورت حال چین میں تھی۔ انہوں نے ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کے لئے ارتقائی دور کا جائزہ لیا۔ اور پھر انگریزوں کے دور میں مسلمانوں کی تحریک کے نتیجے میں پرسنل لا کے ذریعہ گنجائشوں کا ذکر کیا۔ انہوں نے شریعت کے خلاف جنگ کے لئے علمی طور پر تیار رہنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اور کہا کہ ایک طویل، خاموش اور موثر جد و جہد کی ضرورت ہے، جس میں علماء، طلباء سب کو حصہ لینا ہوگا اور اتحاد کے ساتھ ملی شعور بیدار کرنے میں وقتی سیاسی اور ذاتی مفادات سے بلند ہو کر کام کرنا ہوگا۔

اس سے قبل مولانا خالد غازیپوری نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا، جسمیں انہوں نے کہا کہ مسلمانوں میں شریعت سے وابستگی کا جس سے اظہار ہوتا ہے، اس کے تحت معاشرے کی شیرازہ بندی کرنا ہے اور مومنانہ یقین کے ساتھ شریعت کو عملی زندگی میں لانا ہے۔

١٤ مارچ کو ہندوستان میں شریعت اسلامی کے موضوع پر ایک کل ہند سہ روزہ سیمینار ملک میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کا تہیہ کر کے اختتام کو پہونچا۔ جسمیں مسلمان شرع کے پابند ہو سکیں۔ ملی اتحاد اور اتحاد بین المسلمین کیلئے راہ ہموار ہو۔ بچوں میں اسلامی تعلیم عام ہو۔ سبھی شعبوں سے تعلق رکھنے والے برادری، ذات پات، حسب و نسب اور ثروت و منصب کی بنیاد پر آپسی تفریق کو بالکل ختم کر کے اسلام، کلمہ حق، قرآن اور حدیث کے مرکز پر مجتمع ہو جائیں۔ طلباء اور نوجوانوں کو منظم کر کے ان میں ملی وحدت کا احساس بیدار کیا جا سکے۔

سیمینار نے ان اور کئی دوسرے مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنی مختلف قراردادوں میں کئی طریقے تجویز کئے ہیں جس میں یہ بھی ہے کہ علما اور دوسرے پڑھے لکھے لوگ شہر اور گاؤں کے دورے کریں۔ اجتماعات، جلسے، مذاکرے وغیرہ کا اہتمام کیا جائے۔ اور نشر و اشاعت پر زور دیا جائے۔

سیمینار نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کی زندگی کی تنظیم ایک شرعی فریضہ ہے۔ جو بغیر امیر کے انجام نہیں پا سکتا۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ پر جسے سارے ملک کے مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے زور دیا ہے کہ صوبہ وار امارت شرعیہ کا نظام قائم کرے۔ اور یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ مسلمانوں کے مابین مسائل اور تنازعات کو حل کرنے کے لیے ہر علاقے میں دار القضاء کا قیام کیا جائے اور یوپی میں فوراً ہی قائم کر دیا جائے۔

سیمینار نے طے کیا کہ یوپی کے لیے ایک مرکزی دار القضاء ہو جس کا صدر مقام لکھنؤ ہو۔ اس کے ساتھ لکھنؤ کے لیے دار القضاء کے قیام کا بھی اعلان کیا گیا۔ جس کا دفتر فی الحال ٩٩ گوئن روڈ پر قائم کیا گیا ہے اور جس کا ایک جلسہ ٢٦ مارچ کو ہوگا۔

سیمینار نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ قضا کے نظام کو جلد سے جلد قائم کرنے کے لیے قاضیوں کی تربیت کی خاطر امارت شرعیہ بہار واڑیسہ پھلواری شریف میں ایک پندرہ روزہ تربیتی کیمپ قائم کیا جائے۔

سیمینار نے ہندی میں ایک پندرہ روزہ جریدہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو تحفظ شریعت اور تمام دینی و ملی مسائل کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ سے بھی مسلمانوں کو باخبر کرتا رہے۔ اس سلسلے میں ایک کمیٹی کا قیام کیا گیا ہے۔

سیمینار نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ دفاع شریعت کمیٹی قائم کی جائے جو شریعت اسلامی کے خلاف تحریروں اور تقریروں پر نظر رکھے۔ اور ایسے تمام مسلمانوں سے رابطہ قائم کرے جو شریعت کے سلسلے میں صاف ذہن نہیں رکھتے اور ان کو علمی اور فکری طور پر مطمئن کیا جائے۔ کمیٹی کا یہ بھی فرض ہوگا کہ غیر مسلم حضرات سے ملاقاتیں کرے۔ خصوصاً نچلے طبقے کے لوگوں سے اور ان کو شریعت کے بارے میں بتائے۔ اور ان میں غلط فہمیوں کو دور کرے۔

سیمینار نے بین المدارس علمی، ثقافتی اور عملی میدان کے روابط بڑھانے کے لیے مذاکروں، ملاقاتوں اور تبادلہ خیال کے لیے مواقع فراہم کیے جائیں۔ توسیعی خطبات، سیمینار و مذاکرہ پر زور دیا۔ اسلامی لٹریچر کی تیاری، وفاق المدارس، مسلم طلبا اور عام مسلمانوں اور نوجوانوں کی ذمہ داریوں اور ان کے طریقہ کار، تبلیغ مسائل دین اور اشاعت نظام شریعت سے متعلق کمیٹیوں کے قیام سے متعلق بھی قرار دادیں منظور کیں۔

سیمینار نے ایک قرارداد میں یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ اختلاف رائے ایک فطری عمل ہے اور اختلاف رائے اہل حق میں بھی ہمیشہ پایا گیا ہے۔ محسوس کیا کہ اختلاف رائے تفرقہ، انتشار اور نزاع کا سبب نہیں بننا چاہئے۔ اختلاف رائے حدود ادب میں ایک فطری اور حقیقت پسندی پر مبنی امر ہے۔

سیمینار نے مسلم پرسنل لا بورڈ سے اپیل کی کہ مدارس عربیہ کا ایک ملک گیر سطح پر نمائندہ سیمینار منعقد کرے۔

سیمینار نے مرکزی دار القضاء لکھنؤ کے لیے مندرجہ ذیل افراد کے نام قاضی کونسل صدر مسلم پرسنل لا بورڈ کے پاس منظوری کے لیے بھیجے ہیں۔ مولانا فخر میاں فرنگی محلی، مولانا حبیب الحلیم فرنگی محلی، مولانا عبد العلیم فاروقی اور مولانا عبد الاول (دونوں دار المبلغین)، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا محمد ناصر علی اور مولانا عتیق احمد (دار العلوم ندوۃ العلماء) مولانا عبد الغفار ندوی (سکریٹری جماعت اسلامی یوپی)، اور قاری ابو الحسن (جامع مسجد مچھلی محال)، اس کونسل کا کنوینر مولانا برہان الدین سنبھلی کو مقرر کیا گیا ہے۔

سیمینار نے ہندی جریدہ نکالنے کے سلسلے میں ڈاکٹر ہارون رشید صدیقی، ڈاکٹر غیاث الدین، مولانا سراج قمر، ماسٹر اطہر حسین اور سید اسحاق حسین پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی ہے۔

سیمینار نے جو صوبائی ایجوکیشن پرسنل لا بورڈ اور انجمن شباب اسلام کے زیر اہتمام نور الاسلام نسواں اسکول بارود خانہ میں ہوا اسکول کے بانی ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے سیمینار اور قیام کے لیے اسکول کی عمارت دے دی۔ ساتھ ہی سیمینار میں تعاون دینے کے لیے شہریوں کا بھی شکریہ ادا کیا گیا۔

مطالعہ کی میز پر

محمود الازہار ندوی

محب وطن اقبال:

تالیف:۔ سید مظفر حسین برنی۔
پبلیشر ہریانہ ساہتیہ اکیڈمی، چنڈی گڑھ
قیمت ٢٥ روپیہ طبع دوم ١٩٨٥ء،
صفحات ١٦٨، سائز $\frac{18\times22}{8}$،

اقبال اور قومی یکجہتی کے عنوان پر جناب سید مظفر حسین برنی صاحب نے بھوپال یونیورسٹی میں ١٣ جنوری ١٩٨١ء کو یہ خطبہ دیا تھا آپکا یہ خطبہ انگریزی زبان میں تھا جسے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے اردو کا قالب دیا ہے اس کا پہلا ایڈیشن ١٩٨١ء میں اقبال اور قومی یکجہتی کے عنوان سے شائع ہوا تھا اسکا دوسرا ایڈیشن ہے جو نظر ثانی اور اضافہ کے بعد مذکورہ بالا نام سے شائع ہوا ہے۔

جناب مظفر حسین برنی صاحب نے اپنی مشغولیات اور ذمہ داریوں سے وقت نکال کر اپنے ذوق سخن اور اقبال کے فکر و تخیل پر ایک مبسوط مقالہ پیش کیا ہے، جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے اس کے ذریعہ اقبال کے فکر تک رسائی حاصل کرنے کی ایک اہم کوشش ہے۔

آپکا یہ مقالہ وطن پرستی، ہندوستانی فکر و فلسفہ کا اثر، تحریک آزادی، قومی یکجہتی نئی زندگی کے آئینے میں، اور اقبال و پاکستان جیسے اہم موضوعات پر مشتمل ہے اس کے اندر آپنے اقبال کے فکر و تخیل کو پیش کیا ہے سب سے آخر میں اپنا تجزیہ یا خلاصہ نظر بازگشت کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ اقبال کے نظریہ وطنیت و قومیت، اتصال اور بیان مسلم (؟) اور اسلام کے مخاطب کون ہیں اور روحانی اقدار جیسے اہم نکات پر غور کر کے اقبال کے فلسفہ خودی کے اسرار تک رسائی حاصل کرنے کی دعوت دی ہے، اس لحاظ سے برنی صاحب کے قلم سے اقبالیات پر ایک گراں قدر اضافہ ہے اور اقبال شناسی میں ایک نئے باب کا آغاز ہے

قومی تعمیر کی دستاویز

از ڈاکٹر عبد الاحد،
پبلیشر، وحدت انسانیت فاونڈیشن پوسٹ بکس نمبر ٤٨٠ بنگلور ٢ قیمت ٣٠ روپے پہلا ایڈیشن ١٩٨٥ء سائز $\frac{18\times22}{8}$
صفحات ٢٢٨۔

ڈاکٹر عبد الاحد صاحب بنگلور یونیورسٹی میں شعبہ اردو سے منسلک ہیں اور انکے زیر نگرانی پی، ایچ، ڈی کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے آپ نے اس کتاب کو ان شہریوں کی نذر کی ہے جنھوں نے اردو کو قومی اتحاد کے حق میں صحیح یا غلط طور پر مضر رساں سمجھا، اسکی مخالفت کی اور اب بھی کئے جا رہے ہیں جو ذہنی کجی کی بنا پر اس حسین و کار آمد زبان کی بدخواہی کرتے ہیں اور انجام کار ملک و قوم کے نادان دوست ثابت ہوتے ہیں جنھوں نے اردو سے محض رسمی ہمدردی اور زبانی جمع خرچ کا معاملہ کیا اور کچھ تو دوستی ادا نہ کیا جوائے مادری زبان تو کہتے ہیں یا خود کو اردو کے محاذ کا حامی باور کراتے ہیں مگر افسوس کہ عمداً نہ صرف اپنے بچوں کو اردو سے نابلد رکھتے ہیں بلکہ اسی کی خاطر--- حوصلہ مندی نہیں دکھاتے، یہ کتاب پانچ ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے جس کے عناوین سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی رخ و جہت کو پیش کرتی ہے۔ آغاز میں اردو کو مشترکہ تمدن کی حسین یادگار، اردو ایک زبان ہی نہیں ایک تہذیب بھی ہے، اردو کی اتحاد پسندی، اردو شعر و ادب جیسے اہم موضوعات ہیں اور اردو کو قومی یکجہتی کی علامت بنایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ اردو زبان کے علاوہ ایک مسلسل تہذیبی روایت بھی ہے یہ ہماری پچھلی چھ سات صدیوں کی چمن کا حاصل ہے اس نے کسی کو فیض یاب ہونے میں اپنے پرائے کا فرق نہیں کیا اس کے نزدیک اچھی چیزیں اور عظیم شخصیت ہر قوم کی یکساں میراث و ملکیت ہیں۔

اسی طرح کلاسیکی ادب میں یکجہتی کا مفہوم، ہندوستانی عناصر کا عموم سیاسی و سماجی شعور اور ادب، اہل اردو اور ہندوستانی ادب اور مختلف تحریکیں، سرسید کا شش تنقید کے آئینے میں، جدید تصور قومیت، عالمگیر قومیت اور اردو، دور جدید میں یکجہتی کے محرکات قومی اتحاد، آزادی وطن، پاس ناموس وطن تعمیر قوم جیسے اہم موضوعات ہیں ماسب کے آخر میں قومی یکجہتی ایک مطالعہ کے عنوان کے تحت، حب وطن، قومیت، مشترکہ قومی زبان، ریاست یا حکومت سے وفاداری قوم میں جذباتی ہم آہنگی اور قومی علامتوں کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں کہ۔

(١) حکومت کو چاہئے کہ وہ لوگوں کی ذہنی تربیت کی طرف فوری توجہ کرے (٢) اکثریتی فرقہ کا سماجی فریضہ ہے کہ اپنی پوزیشن کا ناجائز فائدہ ہرگز نہ اٹھائے (٣) اقلیت کیلئے ضروری ہے کہ خود اعتمادی پیدا کرے (٤) سماج کے تعلیم یافتہ لوگوں کا فرض ہے کہ غیر ذمہ داری کا کام بھول کر بھی نہ کریں۔

موضوع کے لحاظ سے کتاب پر از معلومات ہے اور مؤلف نے جا بجا اتحاد و یگانگت کی زریں مثالیں پیش کر کے اپنے فکر و تخیل کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ جس پر ہندوستان کے مختلف مذاہب اور نسل کے لوگ گامزن ہو کر ایک اچھا نمونہ بن سکتے ہیں بایں طور یہ کتاب بجا طور پر قومی تعمیر کی دستاویز کہلانے کی مستحق ہے۔

گائے کا قاتل کون؟ اہم الزام کسی پر

از الحاج عبد الکریم پاریکھ، ناشر مکتبہ ذکری، رامپور، قیمت ٥ روپے، صفحات ٨٠، پہلی بار ١٩٨٥ء سائز $\frac{20\times30}{16}$

الحاج عبد الکریم پاریکھ ناگپور کے علمی حلقوں میں معروف و مشہور ہیں، آپ وہاں مستقل درس قرآن دیتے رہتے ہیں--- ------- اور جب آل انڈیا پیمانہ پر گو ورکشا سمیلن (تحفظ گائے کانفرنس) ١٩٧٧ء میں ناگپور میں منعقد ہوئی تھی تو آپ نے تحفظ گائے، اور ہندوستانی مسلمان کے عنوان سے تقریر کی جو مذکورہ مکتبہ سے شائع ہو چکی ہے۔

آپ نے اس کتابچہ میں معلومات اور حوالوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ گائے سے فائدہ اٹھانے والے حقیقۃً حکومت اور بڑے بڑے اکثریت کے تاجر ہیں جو گائے کا گوشت چمڑا، ہڈی، سینگ کے ذریعہ لاکھوں کا کاروبار کرتے ہیں، برآمدات، سنہ وار اعداد و شمار کے ساتھ مذکور ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ کن کن صوبوں میں اس کا استعمال وہاں کی غریب آبادی کی زندگی کا جزء ہے۔ جبکہ وہ صوبے خالص ہندو ہیں اس سلسلہ میں آپنے ایک وفد کے ساتھ گائے کے مارکسٹ ونو باجی سے ملاقات کی تھی اور ان کے سامنے پوری تفصیلات رکھی تھی جسے وہ تسلیم کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اکثریت کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف جو چند موضوعات قابل اشتعال انگیز ہیں ان میں سرفہرست گاؤکشی بھی ہے اس لحاظ سے اس حساس موضوع پر الحاج عبد الکریم پاریکھ صاحب نے اصل حقیقت کو بے نقاب کیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی جانب سے ایک اہم فریضہ ادا کیا۔ کاش اکثریت کے دانشوروں اور ذی ہوش انسانوں کے عقل تک اس حقیقت کی رسائی ہو سکے۔

نان و نفقہ کا مسئلہ

تحریر مولانا جمیل احمد نذیری، ملنے کا پتہ مکتبہ صداقت مبارکپور اعظم گڑھ صفحات ١٦٨، قیمت گیارہ روپے بار اول ایک ہزار سن طباعت ١٩٨٥ء سائز $\frac{20\times30}{16}$

شاہ بانو مقدمہ میں سپریم کورٹ کے فیصلے کی وجہ سے شرعی نصوص کی تشریح میں اہم کتابیں اور پمفلٹ آگئے ہیں اور اس سے متاثر ہو کر مولانا جمیل احمد نذیری صاحب نے نفقہ اور متعہ کی قرآن و حدیث کی روشنی میں تشریح کی ہے اس کتاب میں نان و نفقہ کا مسئلہ، بیوہ کا نفقہ، نفقہ مطلقہ، عدت کے بعد نفقہ؟ متاع کی بحث، نفقہ مطلقہ اور شاہ بانو کیس شکوک و شبہات، اشکالات و اعتراضات طلاق کے بعد دشواریاں اور انکا حل، نفقہ اولاد، نفقہ والدین، نادار اعزاء کا نفقہ، غلام و باندی کا نفقہ، جانوروں کا نفقہ جیسے اہم موضوعات کے تحت نفقات کی تمام قسموں کی توضیح اور تشریح کی ہے، اور اس ضمن میں متاع کے معنی اور تفسیر کو تفصیل سے بتایا ہے، متاع اور مہر کا تعلق، متاع مہر کی جگہ، مہر متاع کے بغیر، متاع مہر کے علاوہ، متاع بمعنی نفقہ، متاع بمعنی متعہ، متاع کے وجوب و استحباب میں فیصلہ کن نقطہ نظر، متاع یا متعہ کی مقدار کو بتایا ہے اسی طرح دفعہ ١٢٥ کی تشریح اور شاہ بانو نادار مطلقہ نہیں اور ناداری و مفلسی وجوب نفقہ نہیں کے تحت اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت کو پوری کرتی ہے یعنی متاع کی تشریح اور نان و نفقہ پر سیر حاصل بحث کرتی ہے اور اسلام کی روح کو اس بابت بتاتی ہے کہ شریعت متاع اور نان و نفقہ سے کیا مراد لیتی ہے۔ اور اس پر کس حد تک عمل کرنا چاہیے۔

نفقہ مطلقہ اور اسلامی قانون

تحریر شمس پیرزادہ، ناشر ادارہ دعوۃ القرآن ٥٩ محمد علی روڈ، بمبئی ٣، صفحات ٣٢ قیمت ٢ روپے سائز $\frac{18\times22}{8}$۔

سپریم کورٹ نے محمد احمد خان بنام شاہ بانو کیس بابت نفقہ مطلقہ ٢٣ اپریل ١٩٨٥ء کو جو فیصلہ کیا تھا اور اسے مسلم پرسنل لا میں صریح مداخلت قرار دیا گیا، کو سامنے رکھکر شریعت کی روح کو پیش کیا گیا ہے، یہ مقالہ مسلم پرسنل لا آل انڈیا سیمینار منعقدہ ١٢ اکتوبر ١٩٨٥ء کو زیر اہتمام اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا میں پیش کیا گیا، یہ مقالہ حسب ذیل اجزاء پر مشتمل ہے۔ اسلام کے عائلی قوانین، اسلامی نظام حیات کے غیر منفک اجزاء ہیں۔ مطلقہ کے نفقہ کا حکم قرآن میں، مطلقہ کا نفقہ اور سنت رسول، نفقہ مطلقہ اور فقہ اسلامی، مطلقہ کے لئے متاع، مطلقہ کے لئے معاوضہ، اسلام میں مطلقہ کے مسئلہ کا حل، کیا تاحیات نفقہ کا قانون مطلقہ کے مفاد میں ہے

مقالہ نگار نے اس مقالہ کی ترتیب میں مستند کتابوں سے استفادہ کیا ہے اور بڑی کاوش کی ہے موضوع اور مواد کو دیکھتے ہوئے یہ مقالہ قابل مطالعہ اور استفادہ ہے اور اس باب میں گرانقدر اضافہ ہے۔